کشمکش

(اصلاحی ڈرامہ)

سید رفیع الدین اشفاق

Comp

کشمکش

سید رفیع الدین اشفاق
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) پی۔ ای۔ ایس
صدر شعبۂ اردو۔ ناگ پور یونیورسٹی

ناشر
ڈاکٹر سید فیروز الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) پی ایچ ڈی (ممبئی)
بیت الاشاعت چھاؤنی ناگ پور (ایم۔ پی)

قیمت ۳

طبع اول ۱۰۰۰

طبع اول ــــــــ ۱۰۰۰ ــــــــ ۱۹۵۴ء

بیت الاشاعت چھاؤنی ناگ پور
(ایم۔پی)

دارالطباعت شکر باغ۔حیدرآباد(دکن)

والدہ مکرمہ کی خدمت میں

جن کی بیوگی کی المناک گھڑیاں اس ناچیز کی تعلیم و
تربیت اور کڑی لیکن شفقت آمیز تادیب کی
مسرت انگیز جانکاہیوں کی نذر ہوئیں۔

اشفاق

مقدمہ

از

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری، ایم۔ اے، ایل۔ بی

صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

اردو میں نئے دور کے ادبی انقلاب سے پہلے ادب کی سماجی قدروں کا تصور قابل قبول نہ تھا۔ لیکن اب ادب برائے ادب کا نظریہ ناقابل فہم ہے۔ آجکل ایسے ادیب اور شاعر بھی جو کسی معین نظام فکر کے حامی نہیں ہیں، زندگی اور زندگی کی اقدار کے سہارے ہی اپنی تخلیقات کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک معین اور مرتب نظام زندگی کی حیثیت سے اردو ادب اب تک صرف دو تحریکوں سے روشناس ہوا ہے۔ ایک تو اسلامی نظام حیات کی ترجمانی ہے جس کے آغاز کا سہرا شعر میں حالی اور ناول میں نذیر احمد کے سر ہے۔ دوسری تحریک ترقی پسند ادب کی تحریک ہے جو ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ منظر عام پر آئی اور رفتہ رفتہ سارے ملک میں پھیل گئی۔ چنانچہ موجودہ دور میں ترقی پسند ادب کو نظرانداز کر کے اردو ادب کا تصور مکمل نہیں سمجھا

اردو ادب میں جہاں تک اسلامی تعلیمات اور نظام حیات کی ترجمانی کا تعلق یہ کوئی نئی تحریک نہیں ہے بلکہ اردو کا بیشتر ابتدائی ادب جو صوفیانہ شاعری، مرثیہ نعت اور منقبت پر مشتمل ہے، اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ آج تک بھی ہمارے کچھ ادیب اور شاعر کسی نہ کسی نہج سے اسلامی طرز فکر اور نظام زندگی کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں

البتہ حالی کی "مسدس مدوجزر اسلام" سے اردو ادب میں ایک نئی لے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے اسلامی تصورات کی ترجمانی کا ایک روایتی یا معتقدانہ انداز تھا۔ حالی نے مسدس کے ذریعہ پہلی مرتبہ مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور اخلاقی حالت کا جائزہ لیا اور اسلام کی حیات پرور تعلیمات کو پیش کر کے مسلمانوں کو ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر زمانے کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور زندگی کی دوڑ میں دوسری قوموں کے دوش بدوش چلنے کی تبلیغ کی۔ جن حقیقتوں کو حالی نے گا کر سنایا تھا، انہیں نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعہ پیش کیا۔ حالی ہی کے زمانے میں شبلی اور شبلی سے زیادہ اکبر الہ آبادی نے اپنے اپنے انداز میں اس دبستان خیال کی ترجمانی کی۔ اکبر الہ آبادی خصوصیت کے ساتھ یورپ کی بڑھتی ہوئی تہذیب کو اسلامی زندگی کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے اسی لئے انہوں نے طنز و تضحیک کے ذریعے ہر نئی تحریک کا خاکہ اڑانا شروع کیا۔ شبلی اور اکبر کے اسی طرز فکر نے اقبال کو جنم دیا۔ اقبال نے بالکل اچھوتے زاویے سے اسلام کا جائزہ لیا اور اردو ادب میں پہلی مرتبہ اسلام کو ایک مکمل مربوط اور عالمگیر نظام حیات کی حیثیت سے روشناس کیا۔ اس مقصد کے لئے اقبال نے فکر و فن کی ہر توانائی کو اس طرح استعمال کیا کہ ان کی شاعری کے آگے غزل کی رعنائیاں اور قومی شاعری کا جوش و خروش دونوں ماند ہو کر رہ گئے۔ اقبال کے بعد اس کے انداز فکر اور قدرت بیان کو نباہنا کسی شاعر کے لئے بھی مشکل تھا لیکن اسی زمانے میں ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دوسرے ممالک میں بھی اسلام کی صحیح تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کا جو اجتماعی رجحان پیدا ہو گیا تھا اسی رجحان نے ہندوستان میں اردو ادب کو فائدہ پہنچایا چنانچہ اس نئے اسلامی تصور نے

اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج کے لئے جہاں دوسرے ممکنہ ذرائع اختیار کئے وہاں ادب کی اثر آفریں طاقت سے بھی فائدہ اٹھایا. چنانچہ اردو نظم و نثر کی کوئی صنف ایسی نہیں جو اسلام کے صحتمند اور ہمہ گیر تصور حیات کے پرچار کے لئے استعمال نہ کی گئی ہو. یہ کوششیں بعض انجمنوں اور اداروں کی طرف سے اجتماعی طور پر بھی شروع ہوئیں لیکن ان کا قالب و لہجہ اب تک بھی ادبی سے زیادہ تبلیغی ہے۔ برخلاف اس کے جن ادیبوں اور شاعروں نے انفرادی طور پر اسلام کی صداقتوں کو شعر و ادب کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوششیں کیں ان کی ادبی قدر و قیمت بدرجہا زیادہ ہے۔

زیر نظر ڈراما بھی اسی نوع کی ایک عمدہ کوشش ہے! اس کے مصنف نے اسلامی اور غیر اسلامی افکار کے نمایندہ کرداروں کے طرز فکر کے تصادم اور اس کے نتائج سے اسلامی تصور حیات کی صحتمندی اور ہمہ گیریت کو ذہن نشین کرنے کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ پروفیسر رفیع الدین کی یہ سعی اس لئے بھی بہت زیادہ قابل قدر ہے کہ موصوف نے اسلام کو ایک جانبدار معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک غیر جانبدار مفکر اور نقاد کی طرح دیکھا، سمجھا اور پیش کیا ہے. قدم قدم پر وہ خود مخالف نقاط نظر کو ان کی تمام دلیلوں کے ساتھ سامنے لاتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے انداز میں ہر نقطہ نظر کی کوتاہیوں کو نمایاں کرتے جاتے ہیں. کرداروں کے مکالموں سے ہٹ کر ڈرامہ کا یہ آغاز ارتقا اور اختتام غیر صحتمند افکار کی عملی ناکامی اور صحتمند افکار کی عملی کامیابی کی ایسی واضح تصویر نظر کے سامنے لاتا ہے کہ زندگی کی ان صداقتوں کو ہم محسوس کرنے لگتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ڈرامہ نگار کی بڑی کامیابی ہے۔

ایسے سنجیدہ نقاط خیال کو پیش کرتے ہوئے بھی یہ ڈراما ادب کے مرتبہ سے

گرنے نہیں پاتا، بلکہ اس میں ایک دلچسپ مطالعے کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ڈراما ایک عمدہ ادبی تخلیق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نذیر احمد کے بعد پہلی مرتبہ اس ڈرامے کے ذریعہ ہمارے اپنے عہد کے مسائل کے درمیان نظام زندگی کے اسلامی خد و خال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈرامے کا ہیرو اختر ہمارے زمانے کا کلیم ہے اور عابدہ اس کی ہیروئن نذیر احمد کی محمودہ ہے، لیکن یہ ہمارے دور کے ہیرو اور ہیروئن ہیں جن کی زندگی ان سارے سماجی، مذہبی، سیاسی، عقلی اور فکری مسائل سے دوچار ہے جو ہمارے عہد سائنس اور فلسفیانہ رجحانات کا خاصہ ہیں۔ ان مسائل سے ڈراما نگار کا شعور ہر جگہ نبرد آزما دکھائی دیتا ہے۔

ڈراما کا لب و لہجہ نہایت شستہ بلکہ ادبی بھی ہے۔ ڈرامے کی کہانی بہ یک وقت اندوہ ناک اور حسین ہے اور اس کا عمل حادثات سے زیادہ ڈرائنگ روم کے فلسفیانہ مکالموں کے سہارے نشو و نما پایا ہے، اسی لئے عمل کا اثر زیادہ تر فکری ہے۔ یہی فکری ڈرامائیت اس کارنامے کی خصوصیت بھی ہے، اور شاید یہ ایک نئی ٹکنیک بھی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی توقع ہے کہ یہ کارنامہ اردو کے ڈرامائی ادب میں ایک امتیازی مقام پیدا کرے گا۔

عبدالقادر سروری

شعبہ اردو
جامعہ عثمانیہ
یکم مارچ ۱۹۵۴ء

دیباچہ

یہ ڈراما پانچ سال پہلے لکھا گیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب کہ میرے کرم فرما پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے میری توقع سے زیادہ اسے پسند فرمایا۔ میں موصوف کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اسے بغور پڑھ کر مفید مشوروں سے نوازا۔

فنی اعتبار سے کشمکش ایک کامیاب ڈراما ہے یا نہیں یہ فیصلہ تو نقادوں کا کام ہے لیکن اگر زندگی کے متعلق مصنف کے تاثرات کا ہلکا سا نقش بھی قارئین کی نگاہوں کے سامنے آ گیا تو وہ اپنی سعی کو مشکور سمجھنے میں حق بجانب ہوگا۔ کیونکہ یہی مقصد اس ڈرامے کی تصنیف اور اشاعت کا محرک ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر مکرمی پرنسپل ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر عبد القادر صاحب سروری صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب سابق صدر شعبۂ اردو ناگپور یونیورسٹی، ڈاکٹر سید فیروز الدین صاحب اور پروفیسر محمد انعام اللہ صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے مختلف حیثیتوں سے اس کی تکمیل میں میری مدد فرمائی۔ میں ان حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ آیات قرآنی کی تشریح کے لئے مولانا ابو الکلام آزاد کے ترجمان القرآن اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسین و مولانا شبیر احمد عثمانی کے ترجمے اور فوائد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

سید شفیع الدین اشفاق

یکم مارچ ۱۹۵۷ء

۴۰۔ اسٹارکی ٹاؤن۔ ناگپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

مجلسِ اوّل

منظرِ اوّل

[اختر کے مکان کا ایک کمرہ۔ وسط میں ایک میز ہے جس کے چار طرف کرسیاں ہیں۔ ایک کرسی پر اختر بیٹھا ہے اور اس کے مقابل کی کرسی پر اس کا چچازاد بھائی الطاف۔ اختر کے سامنے میز پر قلم، دوات اور کاغذات رکھے ہیں۔ داہنی طرف دیوار سے لگی ہوئی چند الماریاں ہیں جن میں کتابیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں۔ بائیں طرف ایک کھڑکی ہے جو صحن کی طرف کھلتی ہے۔ کھڑکی سے باغ کے پودے اور رنگ برنگ کے پھول نظر آتے ہیں۔ پشت پر دیوار کے ایک کونے میں دروازہ ہے جس میں رنگین پردہ پڑا ہوا ہے۔ اسی دیوار سے لگی ہوئی تین آرام کرسیاں ہیں اور قریب ہی ایک گول میز پر اخبار،

رسالے اور کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔

اختر اور الطاف بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اختر میانہ قد اور چھریرے بدن کا نوجوان ہے۔ عمر ۲۷ سال، چہرہ گول آنکھیں بڑی بڑی، ناک نقشہ بارعب۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھی پائی جاتی ہے۔ چہرے پر غم و غصّے کے آثار ہیں۔ طبیعت پُرجوش ہے۔ اس لئے اکثر بے قابو ہو جاتی ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے طبیعت کی بے چینی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ باتیں کرتے میں اکثر ہاتھ کو جنبش دیتا ہے۔ اُس کے لہجے میں قطعیت پائی جاتی ہے۔ الطاف عمر میں اختر سے ایک سال بڑا ہے۔ اُس کے چہرے کی سنجیدگی اور لب و لہجے کی متانت سے مزاج کا اعتدال ظاہر ہوتا ہے۔]

الطاف۔ (مسکراتے ہوئے)۔ تم میری صاف گوئی پر خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے۔ خیر! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

اختر۔ معاف فرمائیے گا! آپ اپنی لاعلمی کے شکار ہیں۔ اماں کی طبیعت کا آپ نے اندازہ نہیں فرمایا۔ آج ہی سویرے ہزاروں صلواتیں سنا گئیں اور پھر بیٹھے بیٹھے رونے بھی لگیں۔ میں بھی اپنی طبیعت اور رجحانات سے مجبور ہوں۔

الطاف۔ تو تمہیں اس غریب کا اکلوتا بیٹا نہ ہونا چاہیئے تھا۔

اختر۔ اب قدرت کی ستم ظریفی کو کیا کیا جائے!

الطاف۔ اس ستم ظریفی کو نباہنا چاہیئے۔ یہ تمہاری سعادت مندی کا

امتحان ہے۔ پرورش کی جانکاہیوں میں ماں کی ایک رات کی
بے خوابی کا بدل ہماری پوری زندگی نہیں ہو سکتی۔ یہ محبّتِ
مادری کا تقاضا ہے جو تمھاری نظر میں محمود نہیں ہے۔

اختر۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہی محبّت میرے لئے
عذابِ جان بنی ہوئی ہے۔

الطاف۔ بات صرف یہ ہے کہ ماں کی ممتا اپنے اکلوتے کی تباہی کے
تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتی ہے۔

اختر۔ (بگڑکر) اس ممتا کی غلط فہمی کو جہنّم میں ڈالئے۔ زندگی کی
راہ میں ماں کا ہر جگہ خدائی فوج دار بن کر نمودار ہونا اس
کا منصب نہیں ہے۔ پرورش کی جانکاہیوں کے بدلے کسی کی
زندگی کو خریدا نہیں جا سکتا۔

الطاف۔ وہ غریب تمھاری زندگی کو خرید کر کیا کرے گی؟ ماں کی محبت
بے غرض ہوتی ہے۔

اختر۔ تو پھر یہ آسمان سر پر کیوں اُٹھا رکھا ہے؟

الطاف۔ ماشاءاللہ۔ گویا آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ محبت کی ماری اپنے
حاصلِ زندگی کی کوتاہیوں کو دور کرنے کی تمنّا سے بھی باز رہے۔

اختر۔ لیکن میں یہ بھی تو سمجھ سکوں کہ اس بچی ہوئی زندگی میں کمال
اور زوال کو سمجھنے کی صلاحیت بھی ہے۔

الطاف۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عمر کے اسی زمانے میں زندگی کو سنجیدہ نظر

عطا ہوتی ہے۔ تمھارے جذباتی طوفان کا ہیجانی دَور یقیناً زندگی کو چٹانوں سے ٹکرا دے گا۔

اختر۔ جی! یہ اس دل و دماغ کا خیال ہے جسے اِس دور سے گذرنا نصیب نہیں ہوا۔ آپ نے زندگی کی صورت ہی کہاں دیکھی ہے، آپ نے زندگی کو بے نقاب ہوتے ہی کب دیا؟ نغمۂ حیات کے زیر و بم سے آپ کے کان نا آشنا ہیں، دل احساسات سے بیگانہ ہے۔

الطاف۔ (مسکراتے ہوئے) مجھے اس کا اعتراف ہے اور میری دعا بھی یہی ہے کہ میرے نصیب میں وہ کچھ نہ ہو جو تمھیں حاصل ہے۔ لیکن ....

اختر۔ لیکن آپ یہ کیوں بھول گئے کہ والدہ سے محبّت کا والہانہ جذبہ کبھی میرے لئے کاہشِ جان بنا ہوا ہے۔

الطاف۔ یہ نہیں کہ تمھارے اس مبارک جذبے کو میں سمجھتا نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ تمھیں اس جذبے کو کام میں لانا چاہئے۔

اختر۔ یعنی یہ کہ میں زندگی کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں دے دوں۔

الطاف۔ (ہنستے ہوئے) جی نہیں۔ بلکہ زندگی کی باگ ڈور صرف آپ کی عقلِ سلیم کے ہاتھ میں رہے۔ یہ دل و نظر کی پراگندگی شوریدہ سری پیدا کر دیتی ہے۔

اختر۔ (چہرے سے بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے) آپ کے اپنے مواعظ حسنہ

کسی کے جذبات سے یوں نہ کھیلنا چاہیئے۔

الطاف۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے۔ میں تو صرف اس قدر جتانا چاہتا ہوں کہ اب تمھیں اپنے جذبات اور رجحانات سے باز آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چچی جان کی ممکنہ کوشش کے بعد بھی جب منوّر چچا نے انکاری جواب دیدیا تو اب اس معاملے میں تمھارا کچھ سوچنا بھی فضول ہے۔ اور.......

اختر۔ میری نظر میں منوّر چچا کے جواب کی کچھ بھی قیمت نہیں۔

الطاف۔ اور اگر تمھاری محبت حقیقی ہے جیسا کہ تمھارے اس جنون سے ظاہر ہے تو پھر اس صدق و صفا کی انتہائی منزل شادی ہی تو نہیں ہے۔ (مسکرا کر) بلکہ تمھارے فراق کا یہ صدمہ عشق کے جذبے کو تیز تر کر کے تمھیں عرفان کی منزل تک پہنچا دے گا۔

اختر۔ آپ نے پھر مہمل بکنا شروع کر دیا ہے۔ اور منوّر چچا کی حیثیت قانون کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہے۔

الطاف۔ اس سے مجھے بحث نہیں کہ باپ کی حیثیت قانون کی نظر میں کیا ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمھارے اخلاق سے انھیں شکایت ہے، تمھارے لاابالی پن سے وہ نالاں ہیں۔ تمھارے لئے یہ غور و فکر کا مقام ہے۔

اختر۔ (آواز قدرے بلند ہو جاتی ہے)
انھیں آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ یاد رہے

کہ منوّر چچا نے حالات کی نزاکت پر سنجیدگی سے غور نہیں
کیا۔ وہ محض اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔

الطاف۔ ہو سکتا ہے۔

اختر۔ جی ہاں! ہو سکنے کو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ انھیں خوب
سمجھ لینا چاہیئے۔

الطاف۔ (چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے)
لیکن یہ تمھارے خیالات ہی خیالات ہیں۔ شاعرانہ
طبیعت جہاں فطرت کا ایک بیش بہا عطیہ ہے وہاں ایک
بڑی مصیبت بھی ہے۔ کیونکہ زندگی کی ناؤ جذبات کے طوفان
میں کبھی پار نہیں لگ سکتی۔

اختر۔ (غصے سے بے تاب ہو کر)
ہاں تو اگر آپ کے نزدیک میری زندگی ہی جرمِ
عظیم ہے تو مجھے اس شقاوت کا بہر حال شکار ہونا ہے۔

الطاف۔ بھائی! ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ جب انسان شقاوت
کی راہ اپنی طبیعت سے چل سکتا ہے تو سعادت کا راستہ
بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس میں اسے معذور نہ بن
جانا چاہیئے۔

اختر۔ (ترش روئی سے) جی! آپ مجھے معذور ہی تصور فرمائیں۔

الطاف۔ تمھاری بدحالی کے چرچے زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

خاندانی روایات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم سلامتی کی راہ اختیار کریں۔ اس میں ایک خاندانی لڑکی کے ناموس کا سوال ہے۔

اختر۔ اس نیک نامی اور بدنامی کو تو جانے دیجئے۔ یہ دُنیا کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی .... اور اس میں بدنامی کی بات ہی کیا ہے؟

الطاف۔ یہ تو آپ اپنی سمجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تم حد سے بہت آگے بڑھ گئے ہو۔ اب تمہیں کم از کم یہاں پر تو ٹھہر ہی جانا چاہیئے۔

اختر۔ (نہایت برہمی سے) زندگی کی مسرتوں کو پامال کرنے والا درندہ اپنے رویّے کو شرافت کی آڑ میں حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

الطاف۔ یہ اپنا اپنا خیال ہے۔

اختر۔ ضمیر کی آزادی کا غاصب، دقیانوسی قدروں کا دلدادہ اپنی رجعت پسندی میں حق و انصاف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ دنیا اب ان جکڑ بندیوں سے اکتا گئی ہے۔ یہ بند عنقریب ٹوٹنے والے ہیں۔

الطاف۔ ٹوٹ جائیں۔ ہماری بلا سے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی عورت کے ضمیر نے اتنی بے لگامی اختیار نہیں کی جو

تمھاری امّید بر آسکے۔

اختر۔ دُنیا اس کا بھی مشاہدہ کرلے گی۔ ایک فتح، ایک شکست۔

الطاف۔ (مُسکراتے ہوئے)

اس فتح و شکست کے جھگڑوں کو جانے دو۔ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ آیا تمھاری زندگی کی مسرّتیں صرف اسی ایک مقام سے وابستہ ہیں؟

اختر۔ اس بے سر و پا گفتگو سے آخر کیا حاصل!

الطاف۔ میرے بھائی! یہ بے سر و پا گفتگو نہیں ہے۔ میں کام کی باتیں کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمھیں حسن کی طلب ہے اور دولت سے لگاؤ ہے۔ لیاقت ماموں کے یہاں تمھیں دونوں چیزیں ملیں گی ....

سبحان اللہ! جس لڑکی کی پاکیزگی کو دیکھ کر فرشتے شرمائیں اور جس کی لیاقت کے آگے بڑی بڑی اسناد والے سر جھکا دیں، میرا یہ ایقان ہے کہ اسی ایک لڑکی سے وابستگی تمھاری زندگی کی کامرانی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ گو اُس غریب کو اس طوفان کے حوالے کرنا بڑا ظلم ہے۔

اختر۔ آپ اپنا قصیدہ ختم فرما چکے؟

الطاف۔ جی ہاں! اور اب آپ کے ارشاد کا منتظر ہوں۔

اختر۔ آپ کسی کے رجحانات کو زبردستی بدلنے کی سعی کیوں

فرما رہے ہیں؟

الطاف۔ (مسکرا کر) یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ زبردستی کا یہاں گذر نہیں۔ اسی لئے تو خوشامد پر اتر آیا ہوں۔

اختر۔ مصیبت تو یہ ہے کہ آپ اپنی طبیعت پر دنیا بھر کو قیاس کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ مدبرانہ ذہنیت نے انسان کی نفسیات سے آنکھیں بند کر کے فقط پند و نصیحت کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔

الطاف۔ (مسکراتے ہوئے) لیکن کیا تم دیکھتے نہیں کہ میری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ (ہنستا ہے)

اختر۔ یہ آنکھیں نہیں ہیں

الطاف۔ تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں تمہیں کن آنکھوں سے دیکھوں؟

اختر۔ معاف کیجئے گا! آپ کی گفتگو نہایت تکلیف دہ ہے۔ آپ نے زندگی کو مذاق بنا رکھا ہے۔

الطاف۔ میں نے زندگی کو کبھی مذاق نہیں سمجھا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ہوا و ہوس کا مارا انسان عشق و محبت کے گمان میں زندگی کے ساتھ مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

اختر۔ (غصے سے چہرہ تمتانے لگتا ہے)
لیکن آپ اندیشہ جن گئے ہیں تو میں اس کو کیا کر سکتا ہوں۔

الطاف۔ (مسکراتے ہوئے) میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی مجھ جیسے اندھے بن جائیں۔ یہ فتنہ آنکھوں ہی کا برپا کیا ہوا ہے۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ (اختر سے) محمود میاں تشریف لائے ہیں۔

اختر۔ کہدو کہ چلے آئیں.........

(نوکر چلا جاتا ہے)

اختر اس ایک سر کے ہزار سودے ہیں۔

الطاف۔ پھر بھی وہ محمود ہے۔

اختر۔ تو میں کب غیر محمود کہہ رہا ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ قبلہ ایک عرصے سے ابا مرحوم کے وقف کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں مدرسۂ نسوان اور خدا جانے ایسی کتنی تعلیمی اسکیموں کے نفاذ کے لئے رقم درکار ہے۔

الطاف۔ تو کیا مرحوم کی وہ رقم ابھی باقی ہے؟

اختر۔ ہاں تھوڑی سی رقم تو شاید باقی ہو۔ مرحوم نے ایسی جائداد ہی کتنی چھوڑی تھی۔

الطاف۔ (ہنستے ہوئے) اور ان حالات میں جب کہ قوم کی اصلاح کے لئے شاید قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہو۔

[محمود داخل ہوتا ہے۔ اس کا سن ۲۸ سال کے لگ بھگ

ہوگا، یہ ایک دل کش بلند قامت اور خوبصورت نوجوان ہے۔
چہرے سے سنجیدگی اور متانت ٹپکتی ہے۔
[اختر اور الطاف اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں]

محمود۔ (مسکرا کر) السلام علیکم!
اختر و الطاف۔ وعلیکم السلام!
(اختر مصافحے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ محمود سے ہاتھ ملاتا ہے)

اختر۔ خوش آمدید! یہ کیونکر کہوں کہ آپ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کو اب کونسا جنون کھینچ لایا ہے۔ بھائی! میں آپ کی اس چندے والی مہم سے گھبرانے لگا ہوں۔
(محمود اور الطاف مصافحہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں)

محمود۔ (اختر سے)
اس کے لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں لیکن آپ کی یہ وحشت بھی بے جا ہے۔ آپ مطمئن رہیں میں اس سلسلے میں حاضر نہیں ہوا ہوں جس کا آپ کو خدشہ ہے۔ البتہ یہ جنون کی آپ نے خوب کہی یہ حقیقت ہے کہ میں جنون کا تماشائی بننے آیا ہوں۔

اختر۔ بہت خوب! جی! میں آپ کے مسکراتے ہوئے طنز کو سمجھتا

ہوں۔ لیکن میرا جنون یا آپ کا ؟

محمود۔ بس خفا ہو گئے ؟ میں جنون کو کب برا کہہ رہا ہوں ؟

اختر۔ شکر ہے کم از کم اس حد تک تو ہم متفق نکلے۔ زندگی کی کشمکش میں انسان جنون نہ پیدا کر سکا تو وہ اپنی فطرت کے اُس لطیف جذبے سے محروم ہے جو اس کا ازلی حق ہے۔

الطاف۔ (ہنستے ہوئے)

آپ کو اس ازلی حق سے کون روکتا ہے ؟

(سب ہنستے ہیں)

محمود۔ لیکن بھائی اختر! جنون بھی تو ایک سا نہیں ہوتا۔ ایک جنون زندگی کی نفی کرتا ہے اور اس کا ابال اسی ایک طرف ہوتا ہے، اور ایک جنون فطرت کے بے پایاں امکانات کو آشکارا کرنے کی خاطر دل کی گرہ کھول دیتا ہے۔

اختر۔ واللہ! آپ کی اس تقسیم سے میں کلیتہً متفق ہوں۔

محمود۔ (مسکرا کر) شکریہ!

الطاف۔ (اختر سے) لیکن یہ یاد رہے کہ اس تقسیم میں اس شوریدہ سری کا بھی ذکر ہے جو فطرت کی تمام قید و بند سے آزاد ہے۔

اختر۔ آپ کا یہ لطیف اشارہ محض آپ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی طرح ماحول کی قید و بند سے آزاد ہو کر فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

الطاف۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ تقاضے بھی فطری ہوں جنھیں پورا کرنا فرضِ عین ہے تاکہ آزاد روش کی غلط بینی بے لگامی کی مصیبت میں مبتلا نہ کردے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(مسکراتے ہوئے) خدمتِ عالی میں میرا بس یہی معروضہ ہے۔

اختر۔ آپ جس روش کو بے لگامی کا نام دے رہے ہیں وہ بھی غلط ہے۔ میں آپ کے کنایے سمجھ رہا ہوں۔

الطاف۔ (محمود سے مسکرا کر) یہ آپ آخر کیوں خاموش ہو گئے؟

محمود۔ (ہنستا ہے) اس لئے کہ میں آپ کے کنایوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

(سب ہنستے ہیں)

اختر۔ (الطاف سے) ان کی خاموشی کو سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔

محمود۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے چند پہلو پردہ داری کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔

اختر۔ لیکن حقیقت پسند سرشت منافقانہ روش سے ابا کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زندگی بہر رنگ بے نقاب رہے۔ اور یہ سینوں کا ابال کہاں نہیں ہے؟ یہ ایک ایسا کھلا ہوا راز ہے جسے ہر صاحبِ دل جانتا ہے۔

محمود۔ (مسکراتا ہے) بشرطیکہ وہ صاحبِ دل ہو۔

الطاف۔ اور یہ ابال بھی تو غیر ضروری اور بے معنی ہے۔ بلکہ نہایت خطرناک۔

اختر۔ چہ خوب! ایک قیامت نظروں کے سامنے سے گذر جائے اور کوئی متنفس اپنے سینے میں زیروبم محسوس نہ کرے۔

الطاف۔ آخر اس زیروبم کی ضرورت؟

اختر۔ یعنی یہ کہ آپ کے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔

الطاف۔ (مسکراتا ہے) یہ نہیں کہ زندگی کے لئے دل کے وجود کا میں قائل نہیں۔ لیکن بھائی! دل کا صحت مند ہونا بھی تو ضروری ہے۔

اختر۔ (بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) میں آپ کے سامنے سر پھوڑنے سے رہا۔

محمود۔ (مسکرا کر) اس باب میں جناب الطاف صاحب سے میں متفق نہیں ہوں۔ اختر صاحب کا یہ بیان صحیح ہے کہ نفس کی سرگوشیاں متنفس کے لئے قیامت کا سامان کر دیتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی میرا معروضہ یہ ہے کہ زندگی کی خاطر اس سے پناہ مانگی جائے۔

اختر۔ (محمود سے) آپ نے مجھ سے کسی حد تک اتّفاق کیا بھی تو فطرت کے تقاضوں کا گلا گھونٹ کر۔

محمود۔ جی نہیں، بلکہ میں فطرت کو اس طرح تربیت سے سنوارنا

چاہتا ہوں۔

اختر۔ یعنی غیر ضروری اور مصنوعی پابندیوں کے ساتھ؟

محمود۔ جی نہیں بلکہ اس طوفان کو اصلاح و فلاح کی راہ سے گذارتے ہوئے اور تخریبی راہوں کو مسدود کرتے ہوئے۔

اختر۔ جب دل عشق کی نظر پیدا کر لیتا ہے اور محبّت کے طوفان میں گرفتار ہو جاتا ہے تو کوئی پابندی قبول نہیں کرتا۔ اس قوت کے سامنے ہوش مندوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ عقل کی چوکڑی گم ہو جاتی ہے، اس حُسن کی بارگاہ میں بڑے بڑے جابر بادشاہوں کو سرنگوں ہوتے دیکھا گیا ہے۔

الطاف۔ (مسکرا کر) اسی لئے تو اس طوفان سے کھیلنا نہ چاہئے۔

(محمود مسکراتا ہے)

اختر۔ (الطاف سے) یہ خیال آپ کو مبارک۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ فطرت کے اس جذبے کو ناکارہ بنا دینا چاہئے اور زندگی کے جمودی سکون کی خاطر رگ و پے میں دوڑتی ہوئی توانائیوں کو سلب کر لینا چاہئے۔ یہ زندگی سے دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟

الطاف۔ جی نہیں، میرا یہ خیال زندگی سے محبت کی بنا پر ہے۔

اختر۔ زندگی اگر حرکت کا نام ہے تو یہ زندگی سے محبّت نہیں کہی جا سکتی۔ پھڑکتے ہوئے دلوں کے لئے اضطراب آمیز سکون فقط عشق کی بدولت ہے۔ وجود کو زیر و زبر کرنے والا عشق،

عقل کا دشمن سہی لیکن زندگی کی جان ہے۔ باغِ ہستی کی شادابی اسی چشمۂ حیوان کی محتاج ہے۔

الطاف۔ میرے خیال میں تو عشق کا یہ نظریہ ہی تخریبی عنصر لئے ہوئے ہے۔

اختر۔ اگر آپ عشق کی نظر پیدا کرتے تو اس نظریے کو سمجھتے۔ آپ کے سینے میں پھڑکتا ہوا دل ہوتا تو محبّت کی کیفیت سے دوچار ہوتا۔

محمود۔ (مسکراتے ہوئے، اختر سے) آخر یہ آپ نے کیونکر فرض کر لیا کہ بھائی الطاف اس نعمت سے محروم ہیں؟

اختر۔ ان کی گفتگو کے راہبانہ تیور اُسے بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

محمود۔ (مسکراتا ہے) میں اسے مجاہدانہ تیور سے تعبیر کروں گا۔

الطاف۔ (ہنستے ہوئے اختر سے) شکریہ، خوب ہوا جو آپ نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا۔ مجھے اپنی محرومی کا اعتراف ہے اور میں اسی میں خوش ہوں۔

محمود۔ (مسکرا کر) آپ کا یہ اعتراف بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ عشق کی حقیقت یہی ہے کہ اس کی نظر آشکارا نہیں ہوتی اور پھڑکتا ہوا دل بس پھڑکنا جانتا ہے، اس کا مظاہرہ نہیں چاہتا۔ اُسے اپنے اس احساس میں غیر کی خیالی شرکت بھی گوارا نہیں۔ یہ ہجر کے خیال کا مارا عشق وصال کی تمنا کے باوجود

وصال کے خیال سے لرزاٹھتا ہے۔ اس کی یہی کیفیت محبت کے متعلقوں کو ہمیشہ بھڑکائے رکھتی ہے۔ حسن اور عشق دونوں حجاب کے متقاضی ہیں۔

اختر۔ (محمود کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے)
یہ لیجئے! تو گویا آپ کا عشق بھی پردہ نشینی کا قائل ہے۔ بھائی الطاف کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کرتا۔ البتہ ہم نے آپ کے اس حجابی عشق کی داستان ضرور سنی ہے۔ اسی لئے یہ بظاہر بیزاری کا اظہار ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

محمود۔ (مسکراتے ہوئے) مگر آپ اس داستان کو صرف داستان ہی کا درجہ دیجئے گا۔

اختر۔ اچھا تو آپ یہ فرمائیے کہ آخر یہ حجاب کس حقیقت کا نام ہے اور وصال سے گریز کس عشق کا تقاضا ہے؟

محمود۔ یہ اس عشق کے عناصر ہیں جس میں کھوٹ نہیں۔

اختر۔ لیکن آپ کا یہ طرزِ تغافل بھی تو پردہ دری ہی کرتا ہے۔ کھوئے ہوئے دلوں کو دنیا پا ہی جاتی ہے۔

محمود۔ میرا مطلب کھوئے جانے سے کمالِ گم شدگی ہے کہ جس کا پایا جانا محال ہو جائے۔

اختر۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) آپ نے زندگی کو فلسفے

اور منطق کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کے لئے مشاہدہ کی
نظر درکار ہے۔

محمود۔ اس مشاہدے کا اگر ہمیں بیانگ دہل دعویٰ ہے تو یہ مشاہدہ کیسا؟ افشائے راز مذہب عشق میں حرام ہے۔

اختر۔ اس افشائے راز کے پردے میں آپ حقیقتوں کو مستور رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا عشق آخر اندھیروں میں کیوں گم ہو جانا چاہتا ہے؟

محمود۔ جی نہیں! عشق ....

اختر۔ (بات کاٹ کر) آپ عشق کے مفہوم اور اس کی کیفیت سے ابھی نا آشنا ہیں۔

محمود (مسکرا کر) تو پھر اس آشنائی کی کیفیت آپ ہی بیان فرمائیں۔

اختر۔ اچھا لیجئے ملاحظہ فرمائیے۔ عشق کی آتشیں تجلیوں میں زندگی تاریکیوں سے نکل کر روشنی کا منہ دیکھتی ہے۔ زندگی کی تڑپ اور حرکت اسی ایک جذبے کے دم قدم سے ہے۔ زندگی کا مدّ و جزر وجود کو موت کے دوامی سکون سے بچا لیتا ہے۔ یہ آپ کیوں زندگی کو موت کے حوالے کر رہے ہیں؟

محمود۔ (مسکراتے ہوتے) سبحان اللہ! آخر آپ نے بلا تحقیق

فردِ جرم قایم ہی کر دی۔ آپ کا بیان عشق یقیناً زندگی کی تڑپ اور حرکت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن میں جس عشق کا بیان کر رہا ہوں وہ آپ کے نظریئے سے مختلف ہے۔ میں جسے عشق کہہ رہا ہوں اُس کے فروغ کی راہ میں نفسانی رجحانات حجاب بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس باب میں انسان کی مسلسل جدو جہد درکار ہے کہ شرّی قوتیں خیر پر غلبہ نہ پالیں۔

اختر۔ عشق کے فروغ کی راہ میں کچھ بھی رکاوٹ نہیں!

الطاف۔ (مسکراتے ہوئے اختر سے)

لیکن قبلہ! جو لوگ اس راہ پر گامزن ہیں اُن کا تجربہ آپ کے اس بیان کی تکذیب کرتا ہے۔ کم از کم آپ کو میرے اس خیال سے ضرور متفق ہونا چاہیے۔

(محمود اور الطاف ہنستے ہیں)

اختر۔ یہ پابندیاں عارضی اور وقتی ہیں جو سماج کی تنگ نظری نے عاید کی ہیں۔

محمود۔ لیکن یہ فروغ کا مفہوم بھی تو صحیح نہیں ہے عشق کا فروغ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان کے اندر زندگی کا جوش اور جدو جہد کا تقاضا منزل بہ منزل آگے کو بڑھتا رہے۔

اختر۔ اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟

محمود۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جمال کے مختلف مظاہر ہیں۔ خوبصورت چہرے اپنی دل کشی سے قیامت کا سامان ضرور کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس جذبے کو رگ وپے میں دوڑتے ہوئے خون کے حوالے کر دیں تو وہ جذبہ اپنے بے پایاں امکانات سے محروم رہ کر کسی مقام کا پابند ہو جاتا ہے اور........

اختر۔ (کچھ جذبے میں آکر)
میں یہ نہ سمجھ سکا کہ انسان جو گوشت پوست کا پتلا ہے اس کی داخلی کشمکش کا علاج اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

محمود۔ (مسکرا کر) میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ آپ عشق کو جنسی رجحانات کا تابع بنانا چاہتے ہیں۔ بھائی، سچ پوچھو تو اسے عشق کا نام دینا ہی ظلم ہے۔ یہیں پہنچ کر عشق عشق نہیں رہتا۔ یہ طوفان عشق کی آگ کو بجھا دیتا ہے۔

اختر۔ تو پھر اسے آپ کے مذہب میں کیا کہیں گے؟

محمود۔ یہ جنسی رجحان اور جذبۂ حسن پرستی کا مرکب ہے جو اپنی حقیقت میں دونوں سے جدا ہے۔

الطاف۔ (محمود سے) جی نہیں، آپ نے اس میں رواداری سے کام لیا ہے حقیقت میں طبیعت کا یہ ابال صرف اس لئے ہے کہ ہماری خواہشِ نفس ہنوز تشفی کو ترس رہی ہے۔

اختر۔ ہر تمنّا اور آرزو کو تشفی کے لئے تڑپنا ہی پڑتا ہے۔ یہ نفسیاتی

حقیقت ہے۔

محمود۔ تمنائیں اور آرزوئیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ جو مختلف منبعوں سے نکلتی ہیں۔ دراصل ہم جس مقام پر پہنچ کر گفتگو کر رہے ہیں وہ عشق و محبّت کے دائرے سے خارج ہے۔ ہم نے جنسی تعلق کے ساتھ عشق کو جوڑ دیا ہے۔ یہ جذبہ افلاک کی سیر سے محروم ہے۔

اختر۔ ماشاءاللہ! آپ کے عشق کو افلاک کی سیر مبارک۔ میں زندگی کے حقایق سے بحث کر رہا ہوں۔

الطاف۔ مصیبت تو یہ ہے کہ عورت کا فریب انسان کو محبّت کے گمان میں مبتلا کئے رہتا ہے۔ یہ ہمرہان سُست عناصر کی طبیعتوں کا ابال ہے جسے ہم نے عشق و محبت کا نام دے رکھا ہے۔

اختر۔ (محمود سے) جب ہم محبت کو ملکوتی صفات بخشنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں تو انسان کی محبت کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ آپ محبّت کو لے کر کن بلندیوں میں اُڑنا چاہتے ہیں؟ رنگ و بو کی دنیا میں رہ کر محبت کو بے رنگ بنا دینا بھی بڑا ظلم ہے۔

محمود۔ آپ نے اسے ظلم سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ انسان کا محبّت بھرا دل اسی طرح آفاقی بن جاتا ہے اور اس کی نظر ہر شے میں محبوبیت دیکھتی ہے۔

اختر۔ زاہدانہ عشق کی سرمستیاں زندگی کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں۔ انسان کا خیال اس طرح فضاؤں میں آوارہ کب تک بھٹکتا رہے گا؟

محمود۔ آپ کا یہ خیال اس بنا پر ہے کہ وجدانی کیفیت کی سرمستیوں سے رندانہ بے لگامیاں ناآشنا ہیں۔ اس جذبے کی تحریک زلف اور خط و خال سے آگے کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ یہ جنون خیز وارفتگی ساغر و مینا کی ہوس نے پیدا کی ہے۔ نسیم سحر کے دوش پر دیار حبیب سے سبوح قدوس کے عطر بیز جھونکے اس غریب کی قسمت میں نہیں رکھے گئے ہیں۔

اختر۔ (آواز کو قدرے بلند کر کے)
آخر اس زندگی کو سبوح قدوس کے عطر بیز جھونکوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ خیالی دنیا کی طلسمی کیفیت راہبانہ زندگی کو مبارک! وہ آنکھ جو نظر فروزی کی اداؤں کو دیکھنے سے عاری ہے، وہ کان جو سامعہ نوازی کے احساس سے بیگانہ ہیں، حقیقت حال سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جمال کے لئے عشق کی نظر درکار ہے۔

محمود۔ یہ آپ نے عشق کو خانہ زاد کیوں بنا رکھا ہے؟ اگر آپ کو عشق کی نظر حاصل ہے تو مبارک! اگر میرا معروضہ یہ ہے کہ وہ نظر فقط عشق کی ہو، خالص عشق کی۔ زمان و مکان سے آزاد،

اجل کی دستبرد سے دور، زندگی کی تمنائیں اپنی ہیجانی کیفیت کے ساتھ ایک رقص کی تڑپ لے کر اٹھیں، رقص اور ہمہ رقص تاکہ زندگی اپنے بے پایاں امکانات کو لئے ہوئے ایک لازوال حرکت سے فروغ پاتی رہے۔ نظر میں الجھاؤ نہ رہے، خیالات میں پراگندگی نہ ہو، پرواز کے حوصلے فضاؤں کی پہنائیوں میں تنگی محسوس کرنے لگیں۔ نفسِ مطمئنّہ کی یہ سیمابی کیفیت حیاتِ جاوداں کی ضامن ہے۔ نغمۂ داؤدی اسی عشق کی پکار ہے، صدقِ خلیل اسی آگ کا فدائی ہے کہ شعلوں میں بھی اُسے حسنِ لایزالی کی جلوہ نمائیاں نفسِ مطمئنّہ بخش رہی ہیں۔ خاک و خون میں رقص کرتی ہوئی زندگی اسی عشق پر نثار ہے۔ اسی ایک جذبہ صدق و صفا کو آبِ حیات کے جام سے نواز اگیا ہے۔

الطاف۔ (بنظرِ استحسان محمود کی طرف دیکھتا ہے)
سبحان اللہ! یہ عشق نہیں، زندگی ہے۔ زندگی نہیں، عشق ہے۔

اختر۔ نہ عشق، نہ زندگی۔ شاعری ہے، محض شاعری۔
(محمود سے) اب آپ سطحِ ارضی سے دُور اُڑنے لگے۔
(الطاف کی طرف دیکھ کر) اور آپ بہت دیر میں بے دلی کی نیند سے بیدار ہوئے۔

(سب ہنستے ہیں)

محمود۔ (مسکراتے ہوئے اختر سے)
کیا آپ دیکھتے نہیں؟ ہم سب سطح ارضی پر ہیں۔
زندگی کی یہی حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے ہم کنار ہو کر
شاعری بھی زندگی بن جاتی ہے۔

اختر۔ آپ کے عشق و محبت کا تقدس مسلّم۔ لیکن انسان کے رگ و پے
میں دوڑنے والا خون کچھ اور ہی تقاضا کر رہا ہے۔

محمود۔ یہ تقاضا اُس عشق کا ہے جس کی مدت کا سامان اجل کی
پھونک کے ساتھ ہے۔ اس کا انجام نہ تو فرد کی صلاح و فلاح
کا ضامن ہے اور نہ اس کے ماحول کے لئے صحت بخش۔ یہ
متعدی خوش فہمی ہوا و ہوس کی خیالی تخلیق ہے۔ یہ ایک
دوسرے سے ٹکرانے والے دلوں کا جنون دل و دماغ کی
خرابی کا نتیجہ ہے۔ زندگی کی سرمستیوں سے اسے کوئی واسطہ
نہیں۔ یہ سلگ سلگ کر بجھنے والا عشق انجام کار خاکستر ہی ہے۔

اختر۔ (استہزاء آمیز مسکراہٹ کے ساتھ)
تو پھر انسان کو ملائک سے رشتہ جوڑ لینا چاہئے۔

محمود۔ آپ کا یہ خیال اس بنا پر ہے کہ ہم نے آدم کا منصب
نہیں پہچانا۔

اختر۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے آدم کا منصب نہیں پہچانا۔ آپ کی

نفسیات آدم کی نفسیات سے بالکل مختلف ہے۔

محمود۔ نفسیات کچھ بھی مختلف نہیں، البتہ زندگی کا فریب حیاتِ سرمدی کا پتہ نہیں دیتا۔ عشق کی نمرودی آگ سے گذرنے کے لئے خلیلی سرشت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(خادمہ داخل ہوتی ہے)

خادمہ۔ (الطاف سے)

میاں! آپ کو بیگم صاحبہ نے یاد فرمایا ہے۔

الطاف۔ کہو کہ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(خادمہ چلی جاتی ہے)

محمود۔ (گھڑی کی طرف دیکھ کر)

اب میں بھی اجازت چاہوں گا۔ نو بجا چاہتے ہیں۔ دس بجے ایک جگہ حاضری ضروری ہے۔

(مسکراتے ہوئے، اختر کی طرف دیکھ کر)

مگر اختر صاحب اپنی تازہ ترین غزل کے تین چار شعر سنا دیں تو اس مجلس کا خاتمہ بالخیر ہو۔

(سب ہنستے ہیں)

الطاف۔ (ہنستے ہوئے) میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔

اختر۔ (مسکرا کر، الطاف سے) آپ تو اپنا کام کیجئے۔ آپ کو عشق و محبت کے نغموں سے واسطہ ہی کیا ہے۔

(محمود کی طرف دیکھ کر)

ہاں میں جناب محمود کے متعلق کچھ عرض نہیں کرتا۔

محمود۔ (مسکراکر) آپ تو بس شعر سنائیے۔

اختر۔ (سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر کے گنگنانے لگتا ہے اس کے چہرے پر جذبات کا تلاطم امنڈ آتا ہے۔ وہ ترنم ریز ہے)

شعر عرض ہے۔

محمود۔ ارشاد!

اختر۔ کب ہوا وجہِ تسلّی لطفِ بے پایاں مجھے

محمود۔ کب ہوا وجہِ تسلّی لطفِ بے پایاں مجھے

اختر۔ کب ہوا وجہِ تسلّی لطفِ بے پایاں مجھے
ہر تجلّی دے رہی تھی گرچہ اک پیماں مجھے

محمود۔ خوب کہا ہے۔

الطاف۔ سبحان اللہ! آپ کی شاعری کا کیا کہنا!

اختر۔ ہیں نگاہیں مضطرب لرزیدہ لرزیدہ قدم

محمود۔ ہیں نگاہیں مضطرب . . . . . .

الطاف۔ لرزیدہ لرزیدہ قدم۔ سبحان اللہ کیا کہنا! واہ وا۔

اختر۔ ہیں نگاہیں مضطرب لرزیدہ لرزیدہ قدم
پھر چلا ہے کر خیالِ کوچۂ جاناں مجھے

الطاف۔ کیا خوب کہا ہے۔

محمود۔ بہت اچھا کہا ہے۔ پھر چلا لے کر۔۔۔۔

اختر۔ تسلیم۔ آخری شعر ملاحظہ ہو۔

محمود۔ ارشاد!

اختر۔ پھر فروزاں کر رہا ہوں شمعِ بزمِ بےخودی

محمود۔ پھر فروزاں کر رہا ہوں شمعِ بزمِ بےخودی

سبحان اللہ، کیا کہنا!

اختر۔ پھر فروزاں کر رہا ہوں شمعِ بزمِ بےخودی
آپ کی چشمِ عنایت دے گئی ساماں مجھے

الطاف۔ کیا بات کہی ہے، لاجواب شعر ہے۔

محمود۔ واہ! کیا خوب کہا ہے۔ (مسکرا کر) بھئی واقعی شاعر ہو۔

الطاف۔ اسی لئے تو ان کی حالتِ زار پر رحم آتا ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

اختر۔ تسلیم۔ یہ آپ حضرات کی قدر افزائی ہے۔ شکریہ۔

محمود۔ نہیں صاحب! یہ آپ کے کمال کا اعتراف ہے۔

اختر۔ آپ کی نوازش کا ممنون ہوں اور آپ کی قدردانی کا معترف۔

محمود۔ (مسکرا کر) شکریہ۔ شکریہ۔

(محمود اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ الطاف اور اختر بھی اٹھ جاتے ہیں۔)

اختر۔ (مسکرا کر) تو گویا آپ کو ایک اور تقریر کرنی ہے۔

محمود۔ ہماری قومی مساعی میں باتوں کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے۔

اختر۔ (مسکرا کر) خوب! لیکن آپ کی قومی مساعی میں ایک جنون، ایک ادارہ، اخبار، رسالہ، تقریر، تحریر، سب ہی کچھ ہے۔ بس خدا کے حضور میں قومی کوتاہیوں کے لئے ایک آپ ہی تو پکڑے جائیں گے۔

محمود۔ (مسکرا کر)

اس لئے کہ آپ نے خود کو اس قید و بند سے آزاد کر لیا ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

منظر دُوم

[لیاقت حسین اپنے کتب خانے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ ایک مضبوط جُثّے والے ادھیڑ عمر کے اونچے پورے آدمی ہیں آنکھوں کی چمک سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ خوب صورت چہرے پر ڈاڑھی میں کہیں کہیں سفید بال چمک رہے ہیں۔ تنگ پاجامہ اور ململ کا کرتہ زیب تن ہے۔ سر پر چوگوشیا ٹوپی ہے۔ یہ پرانی دلی کی تارک تہذیب کی تصویر ہیں۔

لیاقت حسین اپنی آزادیٔ رائے کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی گفتگو کے تیور انھیں مصلح کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ گفتگو کی شگفتگی میں کبھی کبھی تلخی بھی پائی جاتی ہے۔

لیاقت حسین کے سامنے ایک میز ہے۔ میز کے دو طرف دو کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ داہنی طرف ایک کھڑکی ہے جس سے باغ کے سبز سبز درخت اور رنگ برنگ کے پھول نظر آتے ہیں بائیں طرف دیوار ہے۔ جس سے لگی ہوئی متعدد الماریاں ہیں۔ ان میں کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے مقابل کی دیوار پر علامہ اقبال کے منتخب اشعار نہایت پاکیزہ خط میں لکھے ہوئے دیدہ زیب فریم میں آویزاں ہیں۔ پاس ہی چند نقشے بھی

لٹک رہے ہیں۔ نقشوں پر سرخی سے کئی نشانات بنے ہوئے ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی میز ہے۔ اس پر اردو، انگریزی فارسی اور عربی رسالے اور اخبار رکھے ہوئے ہیں۔ میز کے اطراف چند کرسیاں ہیں۔ لیاقت حسین کی پشت کی دیوار سے لگی ہوئی کئی الماریاں ہیں جن میں کتابیں سلیقے سے چنی ہوئی ہیں۔ اسی طرف ایک دروازہ بھی ہے جس میں پردہ پڑا ہوا ہے۔

پردہ ہٹتا ہے اور لیاقت حسین کی بیوی نجم النساء داخل ہوتی ہیں۔ اس خاتون کی عمر لیاقت حسین کی عمر سے پانچ سال کم ہوگی۔ وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔

لیاقت حسین سر اٹھا کر نجم النساء کی طرف دیکھتے ہیں]

نجم النساء۔ (لیاقت حسین کے چہرے پر نظر کر کے)
معاف کیجئے گا! میں آپ کے کام میں حارج تو ضرور ہو رہی ہوں۔ لیکن آپ کا زیادہ وقت نہ لونگی۔

لیاقت حسین۔ (بے رخی سے) تو فرمائیے کیا ارشاد ہے۔

نجم النساء۔ آپا جان آج ہی جانا چاہتی ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ آپ کی قطعی رائے معلوم ہو جانی چاہیئے۔

لیاقت حسین۔ آپا جان کا اصرار سر آنکھوں پر۔ لیکن کل کی گفتگو کے بعد اب میری قطعی رائے معلوم ہونے میں انھیں کیا شبہ رہ گیا ہے؟

نجم النساء۔ (تیوری چڑھا کر)
یا اللہ! آخر یہ لیت و لعل تا کجے؟ آج کل شادی بیاہ
کے مسئلے نے والدین کو کچھ کم پریشان نہیں کر رکھا ہے۔ چاروں
طرف "تعلیم" "تعلیم" کی پکار ہے۔ وہ منوّر بھائی کی بچیاں
کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ یہاں تو قسمت کو رونا ہے۔

لیاقت حسین۔ تم نے آخر یہ کیونکر سمجھ لیا کہ تمھاری بچی ایسی ہی نالائق ہے؟

نجم النساء۔ یہ آپ کی خانگی تعلیم کو کون پوچھتا ہے؟ دنیا پوچھتی ہے
"بیٹی کیا پاس ہے؟" میں آپ کے خیالات پر حرف گیری
نہیں کر سکتی۔ لیکن آپ ہی بتائیں کہ اس جہنم کو کیا کیا جائے
جو شیطان نے سلگا رکھی ہے۔

لیاقت حسین۔ یہ جہنّم ہمارے فاسد خیالات کی سلگائی ہوئی ہے۔

نجم النساء۔ بہر حال یہی سہی۔ لیکن ایسے ماحول میں جو یہ بیٹیاں ماں
باپ کے لئے عذابِ جان بنی ہوئی ہیں آخر اس کو کیا کیا جائے؟

لیاقت حسین۔ ہاں تو انھیں زندہ در گور کر دیا جائے؟

نجم النساء۔ خدا کی پناہ! ایک بیٹی اور اس پر اتنی آفتیں!

لیاقت حسین۔ جذبات کی رو میں ہمیں یہ نہ بھول جانا چاہئے کہ ہم اپنی بچی
کو کس کے حوالے کر رہے ہیں۔

نجم النساء۔ اے تو میری بچی تو آپ سے ہی اچھا ہے۔

لیاقت حسین۔ زندگی کی قدروں کو مادی پیمانوں سے ناپنے والا کفو کا صحیح

اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں ہر شخص حیران وپریشان نظر آتا ہے۔

نجم النساء۔ اے ہاں! اسی چھان بین میں بہن کی زندگی بھی تباہ ہوئی۔ کیسے کیسے صاحب ثروت لوگوں کی نسبتیں آئیں۔ یہی کفو کا مسئلہ اس وقت بھی تو درپیش تھا۔ آخر دیا ایک لایق فایق کو دیکھ کر تو یہ دن دیکھنے پڑے کہ بیوگی کی گھڑیاں قیامت کے انتظار میں کٹ رہی ہیں۔

لیاقت حسین۔ موت وحیات میں کس کو دخل رہا ہے؟ ہم نے ......

نجم النساء۔ وہ میاں منظور تو اب تک زندہ ہیں۔ ان میں ایسی کیا خرابی تھی؟ خدا رکھے بھائی کا دم غنیمت ہے ورنہ بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں لینا پڑتا۔

لیاقت حسین۔ (غصے سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے)

شاہدہ اور اس کے بچے سے تمھیں ایسی کیا دشمنی ہو گئی ہے؟ عورت کی فطرت کی کجی اس کے دین وایمان سب ہی کو غارت کر دیتی ہے۔

نجم النّساء۔ (لیاقت حسین کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ کر)

اے نوج! بھلا مجھ کو دشمنی کیوں ہونے لگی۔ میں تو اس بیچاری کی ناداری کو رو رہی ہوں۔ آپ صلواتیں سنانے لگے۔

لیاقت حسین۔ آخر آپ کو ایسی ہمدردی کی ضرورت ہی کیا ہے؟
نجم النساء۔ اے لو! اب ہمدردی کا حق بھی مجھ سے چھین لو۔ اور......
اور مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ نظروں کے سامنے تماشے دیکھوں
اور لب کشائی کی جرأت بھی نہ کروں۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

لیاقت حسین۔ (سکوت کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر)
شاہدہ کے رفیقِ حیات کے انتخاب میں ہم نے اپنی دانست میں کوئی غلطی نہیں کی، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، شریف النفس شخص کو جاہ و ثروت پر ترجیح دی۔ موت و حیات کا علم اللہ کو ہے۔ اور پھر ہم نے شاہدہ کو عقدِ ثانی سے کب روکا؟ تم خود جانتی ہو کہ میں نے اس کے لئے کتنا اصرار کیا۔ لیکن وہ غم رسیدہ اپنے رفیقِ حیات کی یاد اب تک نہ بھلا سکی...... اصل میں......
نجم النساء۔ یا اللہ! یہ کیسا زمانہ آگیا ہے۔ آپ کا تو ہر خیال دُنیا سے نرالا ہے۔ شریف زادیوں کو عقدِ ثانی کرتے ہم نے تو سنا نہیں (ٹھنڈی سانس لے کر)۔ خدا جانے بیٹی کو بھی کیا وہابیت کی تعلیم دے رہے ہیں۔
لیاقت حسین۔ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے بھی زیادہ شرافت کا دعویٰ ہے؟ ...۔ اور یہ وہابیت کیا بلا

ہے؟...... ہاں تم نے یہ ٹھیک کہا کہ عابدہ کو میری ہی تعلیم ہے۔

نجم النساء۔ یا اللہ! یا اللہ! بس اب آپ اپنی بد فالی رہنے بھی دیجئے۔

لیاقت حسین۔ تو کیا ساری زندگی کو اس بد فالی کے حوالے کر دو گی؟ اسلام کو ان لغویات سے کیا واسطہ۔ اسلام فقط زندگی کے حقائق کو دیکھتا ہے اور حقائق کا قیام وقتی جذبات پر نہیں ہے۔ نکاح کے ذریعے فریقین کی وابستگی زندگی کی شیرازہ بندی کی خاطر ہے۔ اگر موت کا ہاتھ یا طبیعتوں کے اختلاف کی ناگواریاں اس بندش کو قایم نہ رکھ سکیں تو اسلام نے اس کے لئے نہایت صالح حل پیش کیا ہے۔ مسلمانوں نے ایسی کتنی اسلامی تعلیمات کو غیر اسلامی قرار دے کر زندگی کی کلفتیں مول لے رکھی ہیں۔

نجم النساء۔ اور سنو لوگو!...... بس آپ مجھے نہ سنائیے...... یہ سب اپنی بیٹی کو پڑھائیے۔ ایک نیا اسلام نکالا ہے۔ الہی توبہ!

لیاقت حسین۔ ہاں ہاں! دنیا کو اسی نئے اسلام کی ضرورت ہے جس حقیقت قدسی کا ظہور......

نجم النساء۔ (بات کاٹ کر) اماں کہتی تھیں "بیٹی ہماری ہے"۔ یا اللہ مرحومہ کی روح کو کیسا صدمہ پہنچے گا!

لیاقت حسین۔ عابدہ کی شادی میں نہ تو مرحومہ کی مرضی کو دخل ہے اور نہ میری تمھاری پسند کو اختیار......

نجم النساء۔ جی ہاں! تو پھر یہ کہیے کہ بس ایک عزیزہ ہمشیرہ کی رائے کو دخل ہے۔

لیاقت حسین۔ اب تمہاری وہمی طبیعت کو کیا جائے! یہاں صرف فریقین کے طبائع کا لحاظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ زندگی کی خوشگواریوں کو قایم رکھتے ہوئے دونوں اس رشتے کے فرائض کو کہاں تک نباہ سکیں گے۔

نجم النساء۔ اور یہ آپ کا ابھی سے فرض کر لینا کہاں تک بجا ہے کہ اختر اور عابدہ اس رشتے کو نباہ نہ سکیں گے۔

لیاقت حسین۔ مجھے اختر کی فطری صلاحیتوں کا انکار نہیں ہے۔ درحقیقت مجھے اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر اسے کیا کیا جائے کہ وہ ماحول کی بدبختی کا شکار ہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ اپنی زندگی میں ضبط قایم نہ رکھ سکا۔ جو شخص زندگی کی پاکیزگیوں سے کوسوں دور ہے وہ اس فرشتہ شمائل لڑکی کا کفو نہیں ہو سکتا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سلسلہ جنبانی صرف دولت کی طمع میں کی گئی ہے۔ تم کیوں اس طوفان سے کھیل رہی ہو؟

نجم النساء۔ خدا جانے لوگوں نے آپ کے کان میں کیا پھونک دیا ہے! آپ تحقیق کی زحمت فرمائیں تو حقیقتِ حال معلوم ہو۔

لیاقت حسین۔ حقیقتِ حال سے دنیا واقف ہے۔ تمہیں محض محبت اور

خوش فہمی نے اندھا بنا رکھا ہے۔ یوں بچپن کی نسبت کا خیال کیا جائے تو اس کا حق شاہدہ کے ور یتیم محمود کو پہنچتا ہے۔ میری نظر میں اس کا کفو وہی ہے۔

...م النساء۔ (برافروختہ ہو کر)

لو صاحب! یہ ایک نیا شگوفہ کھلا۔ میں نہ کہتی تھی اس میں فقط ایک پھوپھی کی پسند کو اختیار ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اگر ایسا ہوا تو یہ ماں سر پیٹ پیٹ کر جان دے دیگی۔

...اقت حسین۔ (نجم النساء کے پریشان اور برافروختہ چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے)

اب تمہاری اس دیوانگی کو کہاں جا کر رویا جائے؟ رشتے اور تعلقات سے قطعِ نظر ہمیں صرف اپنی بچی کی بھلائی مطلوب ہونی چاہئیے۔ میں نے عابدہ کی تربیت میں نہایت جانکاہیوں سے کام لیا ہے۔ یہ بچی میری امیدوں کا مرکز رہی ہے۔ میں نے اسے اپنا حاصلِ زندگی سمجھ کر اسے اپنا سب کچھ دے دیا۔ اس کی تعلیم و تربیت پر مجھے بجا طور پر ناز ہے۔ میں نے اسے قوم کی امانت سمجھ کر پالا اور اس کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی جانکاہیوں سے گذر کر اب اسے اس مقام پر دیکھ رہا ہوں جہاں وہ

زندگی کا سہارا بن سکتی ہے۔ اس کے شریک زندگی کا انتخاب
میں نے تمام عواقب پر نظر ڈال کر کیا ہے۔ مجھے تامل تمہاری
ناعاقبت اندیشی پر رہا ہے کہ ماں کا دل توڑنا مناسب
نہیں معلوم ہوتا۔ اب یہ جو تم نے نیا سلسلہ اٹھایا ہے
اس نے میری تمام امیدوں کو پارہ پارہ کر دیا۔

نجم النساء۔ اے ہے، یہ آپ کے خطرات بے سبب نہیں تو اور کیا ہیں؟

لیاقت حسین۔ تم اختر کی نسبت کو بچپن سے طے شدہ بتاتی رہو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ اختر کا سلسلہ منور بھائی کی بچی سے سنا گیا تھا؟ اب یہاں بچپن کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے؟

نجم النساء۔ جی ہاں ہیں وہی تو کہہ رہی ہوں۔ ہزاروقتوں کے بعد معاملے کو ٹھکانے لگایا ہے۔ رہا زندگی کی ناہمواری کا سوال، سو یہ مسئلہ شادی کے بعد خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

لیاقت حسین۔ تم اس نازک مسئلے کو سمجھ نہیں سکتیں۔ تم نے صرف ایک جذبے کو اپنا امام بنا رکھا ہے۔

نجم النساء۔ (جھنجھلا کر)
وہ کچھ رہی ہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ خدا نے چاہا
تو دو ماہ کے اندر اس فریضے سے سبک دوش ہو جاؤں گی
اور کروں گی وہی جو ٹھان رکھی ہے۔

لیاقت حسین۔ (نہایت برہمی سے، مایوسانہ انداز میں) کیا تم لڑکی کی مرضی

بھی پہچانتی ہو؟

النساء۔ ہاں اپنی بچی کا برا بھلا سب جانتی ہے۔

حسین۔ بشرطیکہ وہ صحیح الدماغ بھی ہو۔

[لیاقت حسین خاموش ہو جاتے ہیں اور میز سے کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتے ہیں۔ نجم النساء چلی جاتی ہیں۔]

منظر سوم

[ایک پرانی وضع کا مکان جس کا ایک کمرہ نہایت کشادہ ہے۔ کمرے کے دو دروازے گلی کی طرف کھلتے ہیں۔ ایک دروازہ زنانے کی طرف ہے۔ اس دیوار میں دو کھڑکیاں بھی ہیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں میں پردے پڑے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی بڑی بڑی الماریاں ہیں جن میں کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔

دیوار پر ایک بڑی گھڑی لگی ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی تپائی ہے جس کے گرد چند آرام کرسیاں ہیں۔ کونے میں ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہیں۔ میز پر قلم دوات اور کاغذات ہیں۔ محمود داخل ہوتا ہے اور الماری سے کتاب نکال کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے۔ اس کے چہرہ سے بےچینی اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ زنانے کی طرف کا پردہ ہٹتا ہے اور شاہدہ خاتون داخل ہوتی ہیں۔ اس خاتون کا سن ۴۸ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن چہرے سے ضعیفی ٹپکتی ہے اس کے سفید کپڑے اس کی بیوگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ چہرے کی نورانیت اس ڈھلتی ہوئی چاندنی کی سی ہے جس نے

چند ساعت قبل بدر کامل کو روشن کیا تھا۔ وہ سر تا پا غم نصیبی کی داستان ہے۔ عفت و عصمت کی ایک جیتی جاگتی تصویر جس کے خوبصورت ہونٹوں سے تبسم کو بھی شاید ہی گذر نا نصیب ہوا ہو۔ وہ اپنے جگر گوشہ پر محبت بھری نظر ڈالتی ہے۔ محمود والدہ کو دیکھکر نیاز مندانہ طور پر سنبھل جاتا ہے۔]

محمود۔ آداب عرض ہے امی جان! یہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی مجھے بلا لیا ہوتا۔

شاہدہ۔ جیتے رہو بیٹا! اللہ تمھیں بامراد کرے۔ ظہر کی نماز سے تو فارغ ہو گئے ہو گے۔

محمود۔ جی ہاں! ابھی مسجد سے واپس آیا ہوں۔ کیوں کیا ارشاد ہے؟

شاہدہ۔ سواری کا کچھ انتظام کیا ہوتا۔

محمود۔ تو آپ عقد میں شرکت فرمانا چاہتی ہیں؟

شاہدہ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا کروں دل نہیں مانتا۔

محمود۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے آپکی شرکت کہاں تک مناسب ہے؟

شاہدہ۔ بیٹیا! مناسب تو قطعی نہیں لیکن ضروری بھی تو ہے۔

محمود۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مجھے اور کسی بات کا خدشہ ہے۔

شاہدہ۔ میری بچی میرے لئے کیسی پریشان ہو گی! مجھے اپنی

عابدہ کی قسمت کا بہر حال تماشائی بننا ہے۔

محمود۔ (والدہ کے پریشان چہرہ پر نظر کر کے) لیکن خدانخواستہ ایک نیا ہنگامہ جو برپا ہوگا۔

شاہدہ۔ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے مجھے بے حس بنا دیا ہے۔ آدمی اپنی زبان بند رکھے تو بہت سے فتنے دب جاتے ہیں

محمود۔ آپکی مرضی ہے تو مناسب ہے تین بجے میرے لئے سواری پہنچ جائے گی۔ میں آپ ہی کے ساتھ چلا چلونگا۔

شاہدہ۔ تین بجنے میں کتنی دیر ہے؟

(گھڑی کی طرف دیکھتی ہے)

محمود۔ (گھڑی کی طرف دیکھکر) اس وقت ڈھائی بجا چاہتے ہیں، آپ تیار ہو جایئے۔

شاہدہ۔ میں تیار بیٹھی ہوں۔

(شاہدہ چلی جاتی ہے)

منظر چہارم

[اختر کے مکان کے زنانہ دالان میں ایک تخت پر چاندنی بچھی ہوئی ہے تخت کے ایک سرے پر اختر کی والدہ بدرالنسار بیٹھی ہیں سامنے پاندان رکھا ہوا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کلثوم داخل ہوتی ہے اور سلام کرکے تخت کے قریب چٹائی پر ستون کے سہارے سے بیٹھ جاتی ہے۔]

بدرالنساء۔ اچھی تو ہو؟

کلثوم۔ خدا کا شکر ہے بی بی، کام کاج سے فرصت ملی جی چاہا سلام کر آدوں، حاضر ہو گئی۔ بہو تو اچھی ہیں؟

بدرالنساء۔ (ٹھنڈی سانس لیکر)
ہاں اچھی ہیں۔ اچھی کیوں نہیں ہیں؟ سب اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں۔ برا کسے کہا جائے؟

کلثوم۔ (بدرالنساء کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے)
اے نہیں! میں دلھن کی طبیعت پوچھ رہی تھی کہ اب صحت کیسی ہے؟

بدرالنساء۔ موئی صحت کو کیا ہو گیا ہے؟ نہ پہلے خراب تھی، نہ اب ہے۔ مگر حنیفہ کی اماں! زمانے کی ہوا بدلی ہوئی ہے۔

وم - ہاں بی بی! آج کل ہوا کی خرابی کی سب ہی شکایت کر رہے ہیں۔ بخار اور کھانسی کی تو عام شکایت ہے۔

النساء۔ اے ہے! تم میرا مطلب سمجھیں نہیں۔ ایک ہمارا بھی زمانہ تھا، اور ایک یہ بھی زمانہ ہے۔ اس صدی کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ چودھویں صدی ہے نا! قیامت قریب ہے۔

(کلثوم بدرالنساء کے چہرہ کو حیرت سے دیکھتی ہے)

سنو کلثوم! شادی کے دن خوشی کے دن ہوتے ہیں۔ زندگی کے یہ دن بہار کے دن کہلاتے ہیں۔ دلھنیں کیسی خوش خوش رہتی ہیں۔ ایسی چپکے چپکے رونے والی دلھن ہم نے نہیں دیکھی۔ ہر دم جلنا، ہر دم کڑھنا، شادی نہ ہوئی غضب ہو گیا۔

لثوم - ماں باپ کی یاد ہے بی بی! ابھی ابھی گھر چھوڑا ہے۔ دل بہلتے بہلتے بہلیگا۔ شروع شروع میں ایسا ہوتا ہی ہے۔

النساء۔ اے ہاں، ایسا ہوتا ہے، یہ میں بھی جانتی ہوں۔ مگر یہاں مزاج ہی کچھ اور ہے۔ آخر میں بھی تو خالہ ہوں، کوئی غیر نہیں۔ مگر اتنی توفیق نہیں کہ مجھ سے کھل کر دو حرف ہی بول لے۔

کلثوم - خالہ ہزار ہوں، پھر بھی ساس بہو کا رشتہ ہے۔ حجاب اٹھتے اٹھتے اٹھیگا۔

بدرالنساء۔ اے نہیں۔ ایسا نہیں کہ میں سمجھتی نہیں۔ کچھ دھوپ میں چونڈا سفید نہیں کیا ہے۔ لڑکی نہایت درجہ مغرور ہے باپ کی دولت پر نازاں ہے۔ اگر یہ شادی میرے بچے کی زندگی کو مسرت نہ بخش سکی تو یہ اس گھر کی بدبختی نہیں تو اور کیا ہے۔ پہلے ہی بہو یاں تھیں کہ شوہر کی خاطر جہنم کی آگ بھی گوارا کر لیتیں اور اختر کی طبیعت سے تم واقف ہی ہو۔ خدا جانے کب کیا کر گزرے۔

کلثوم ۔ مگر بی بی! ایک بات کہوں خدا لگتی۔ آپ کچھ ہی کہیں، صورت سے تو لڑکی سمجھدار معلوم ہوتی ہے۔ نیکی اور بدی میں انسان چہرے سے چھپتا نہیں۔ خدا نے جمال کے ساتھ جلال بھی بخشا ہے۔ مگر بد طینتی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

بدرالنساء۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ آج دنیا میں سیرت ہی کا تو رونا ہے۔ فقط صورت کی خوبی وبال جان بن جاتی ہے۔

کلثوم ۔ سچ ہے بی! سیرت نہ ہو تو صورت بھی زہر لگتی ہے۔

(کلثوم قدموں کی آہٹ پاکر پیچھے مڑکر دیکھتی ہے)

(آہستہ سے) بہو آ رہی ہیں۔ شاید سن لیا ہے۔

بدرالنساء۔ (بے رخی سے) سننے دو۔

(عابدہ داخل ہوتی ہے۔ اس خاتون کا سن اکیس بائیس کے درمیان ہوگا۔ رفتار میں نرمی ہے۔ اس کے خوبصورت

چہرے سے سنجیدگی اور متانت ٹپکتی ہے اور اس کی کشادہ پیشانی
سے انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کی گھنی بھوؤں کے پاس بڑی
بڑی سیاہ آنکھیں نسوانی جمال وجلال کا شاہکار پیش کر رہی ہیں۔
وہ آگے بڑھتے ہوئے سلام کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے۔ کلثوم اپنی
جگہ سے جنبش کر کے سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے۔)

عابدہ ۔ آداب عرض ہے خالہ جان،

بدر النساء ۔ (عابدہ کی طرف دیکھ کر)
جیتی رہو۔ بیٹی، اچھی تو ہو؟

عابدہ ۔ الحمد للہ۔ آپ کی دعا ہے۔
(کلثوم سے) خالہ، تمہاری بیٹی سے میں نے کہا تھا کہ یوں
بیکار وقت گزارتی ہو تو کچھ پڑھ ہی لیا کرو۔ مجھ سے تو آنے
کا وعدہ کر گئی۔ مگر جب سے ایسی غائب ہوئی کہ گویا
اس پر کوئی بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ تم اب
اسے اپنے ساتھ لیتی آنا۔ اللہ نے چاہا تو دو چار روز میں
یہ دہشت دور ہو جائے گی۔

کلثوم ۔ دلہن! یہ تو آپ کی بڑی مہربانی ہے آپ کے صدقے
میں دو چار حرف پڑھ لے گی تو اس کی قسمت جاگ اٹھے گی۔
یہاں لڑکیوں کو پڑھانے والا ہی کون ہے۔

عابدہ ۔ کوئی محلہ ایسا نہیں جہاں پڑھی لکھی خواتین نہ ہوں۔ وہ اپنی اپنی

جگہ کچھ نہ کچھ کریں تو بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

بدرالنساء۔ (تیوری چڑھاکر)
حنیفہ کی اماں! تم اپنی بیٹی کو گھر کے کام کاج سے لگاؤ اس کی عاقبت برباد نہ کرو۔

کلثوم۔ ادی بی بی! کام کاج سے کون لگا ہوا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بیٹی تھوڑا بہت پڑھ لے تو کیا بُرا ہے۔

بدرالنساء (جھنجلا کر)
بڑی بی! تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے پڑھا لکھے دا بھگت رہے ہیں وہ انگریزی تعلیم ہو یا اپنی پرانی تعلیم دونوں نے لڑکیوں کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ پہلا زمانہ تھا کہ بیٹی کام کاج کرتی، شوہر اور بچوں کی خدمت گزاری اس کی زندگی کا مقصد ہوتا۔ اب تو ایک طوفان برپا ہے۔

کلثوم۔ لیکن بی بی آج کل تو چاروں طرف تعلیم تعلیم کی پکار ہے ہم غریب یہ باتیں کیا جانیں۔

بدرالنساء (چیں بہ جبیں ہوکر)
بڑھاپے میں تم بھی سٹھیا گئیں بڑی بی! نئی روشنی میں آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

[اختر کی بہن صوفیہ داخل ہوتی ہے۔ اس کا سن کوئی بیس سال کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کا خوب صورت چہرہ گلاب کے مانند کھلا

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رگ و پے میں زندگی گدگدی کر رہی ہے۔
ہنسنا ہی ہنسنا۔ بات بات پر ہنسنا۔ گویا نہ ہنسیں تو کام نہ چلے۔
اس کے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار ایک رسالہ اور دو کتابیں ہیں)

صوفیہ۔ (عابدہ سے)
اللہ باجی! تو آپ نے محرومی ہماری ہی قسمت میں رکھی تھی؟
آپ کی تبلیغی چوری آج پکڑی گئی۔ ہاں آپ کو بھلا
کیا معلوم تھا کہ یہ بلا آج وقت سے پہلے ہی نازل ہو جائیگی

عابدہ۔ اے واہ! یہ تم نے چوری کی خوب کہی (ہنستی ہے)
کس سازش کا شبہ تھا جو کان لگائے سنا کیں؟ اور تم
جو بلا کا نازل ہونا تم نے کہا ہے سو اس کو منھ لگانے کیا
ہمیشہ تیار ہوں۔ (صوفیہ کھلکھلا کر ہنستی ہے عابدہ مسکراتی ہے)

بدرالنساء۔ (صوفیہ سے)
بیٹی! آج کالج سے سویرے کیسے آگئیں؟

صوفیہ۔ امی جان! آج کرکٹ کا میچ ہے اس لئے کالج جلد
بند ہو گیا۔

بدرالنساء۔ نگوڑا کالج، جب دیکھو بس ایک نہ ایک بہانہ تعطیل کا
نکل آتا ہے۔ سال بھر کی فیس دو اور مشکل سے چھ مہینے پڑھو

صوفیہ۔ خیر سے چھ مہینے بھی پڑھ لیں تو غنیمت جانئے۔

عابدہ۔ (مسکراتے ہوئے) اور پڑھتے پڑھانے کو

کالجوں میں مزدوری سمجھتا ہی کون ہے۔

صوفیہ۔ اے لو! اور سنو ...... تو پھر ہے یہ کس مرض کی دوا؟

عابدہ۔ دوا کی نہ پوچھو۔ آجکل ہر مرض کی دوا عنقا ہو گئی ہے۔۔

صوفیہ۔ (کھل کھلا کر ہنستی ہے)۔ ہاں باجی! آپ کے مرض کی دوا البتہ عنقا ہے۔ آپ کی نظر دنیا سے نرالی ہے۔ آپکا تعلیمی نظریہ بھی ایسا ہی عجیب و غریب ہے جیسی آپ ہیں۔

عابدہ۔ (صوفیہ کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے)

اچھی بہن خفا ہو گئیں؟

بدرالنساء (صوفیہ سے) بیٹی! دنیا میں بزرگی اور خردی کے ساتھ آداب و لحاظ بھی کوئی چیز ہے۔

صوفیہ۔ (منہ بنا کر) اونہہ!

عابدہ۔ (مسکرا کر) خالہ جان! آخر دل کی بات دل میں کیوں رہے۔ (صوفیہ سے) خاموش کیوں ہو گئیں بہن؟ ابھی تو تمہیں بہت کچھ کہنا ہے۔

صوفیہ۔ بس باجی! اب نہ بولوں گی۔

عابدہ۔ (مسکرا کر) اچھا تو میں اصرار بھی نہ کروں گی۔ صوفیہ خود بخود بولنے لگے گی۔

(کلثوم خاموشی سے صوفیہ کے چہرے کا جائزہ لیتی ہے)

کلثوم۔ (اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے عابدہ سے)
اچھا تو دلہن! میں حنیفہ کو آج ہی سے بھیجتی ہوں آپکی
لونڈی دو حرف پڑھ لے گی تو آپ کے حق میں دعا
کروں گی۔ ہم غریبوں کے پاس اس کے سوا اور دھرا
ہی کیا ہے؟

عابدہ۔ خالہ! یہ نہ کہو۔ جو کام اسباب سے نہیں بن پڑتے ان کے
لئے دعائیں ہی کام آتی ہیں۔

کلثوم۔ مگر بی بی! آج کل تو دنیا اسباب ہی پر مرمٹ رہی ہے۔

بدرالنساء۔ (کلثوم سے) اچھا تو جاتی ہو؟

کلثوم۔ جی، بی بی! آداب عرض ہے (صوفیہ اور عابدہ کی طرف مڑ کر)
بی بی! آداب عرض ہے۔

عابدہ۔ تسلیم

صوفیہ۔ تسلیم

بدرالنساء۔ جیتی رہو۔

(کلثوم چلی جاتی ہے)

صوفیہ۔ (چہرے پر سنجیدگی پیدا کر کے)
باجی، یہ جو آپ خانگی مدرسے کا سنگ بنیاد رکھ رہی ہیں
تو اس سے بہتر کسی مدرسے میں نوکری کیوں نہیں کر لیتیں؟

(مسکراتی ہے)
سچ کہتی ہوں باجی آپ کی تقریر نہایت دلنشین ہوتی ہے۔

عابدہ۔ (مسکراکر)
شکر ہے کہ تم نے دلفریب نہ کہہ دیا۔ شاید تم نے اس عجیب و غریب کی تشریح شروع کردی ہے۔ نوکری ہر شخص کرنا چاہتا ہے۔ جسے نوکری نہ مل سکی اس نے لیڈری کرلی۔ زمانے کو خدمت کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ آجکل معلمی بھی نوکری ہے معلمی نہیں۔

صوفیہ۔ اے ہے باجی! یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ نوکری سہی پھر بھی خدمت تو تعلیمی ہے۔

عابدہ۔ یہ خدمت بھی تعلیمی نہیں۔ معلم کی شخصیت قوم کے لئے امین کی حیثیت رکھتی ہے۔ قوم کا مستقبل معلم کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی شخصیت چلتی پھرتی یونیورسٹی کا حکم رکھتی ہے۔ اور جبتک ارباب علم و فضل نے اس خدمت کو خدمت سمجھکر خالصۃً للّٰہ انجام دیا مفید نتائج برآمد ہوتے رہے۔ پھر جب وہ زمانہ آیا کہ اہل فضل نے نوکری کرلی اور محض پیٹ کی خاطر کسی درکی پاسبانی اختیار کرلی تو نہ معلم میں وہ روح باقی رہی اور نہ متعلم میں۔

صوفیہ۔ (مسکراتی ہے) یا اللہ! تو آپ آخر چاہتی کیا ہیں؟

(وہ ہنستی ہے)

عابدہ۔ (مسکرا کر)۔ تم تھوڑی دیر کے لئے اپنی ہنسی موقوف کرو اور میری بات سنو۔ (صوفیہ مسکراتی ہے) میں چاہتی ہوں کہ اس خدمت کے لئے جو بھی آگے بڑھیں وہ خارجی اثرات اور دباؤ سے بالکل آزاد رہیں آجکل معلم کی شخصیت اور اس کی تعلیم کے درمیان جو تضاد پایا جاتا ہے یہ اسی کا فساد ہے۔ جو ہمارے نظام تعلیم میں ایک پراگندگی پھیلی ہوئی ہے۔ اسی لئے جہاں ایک طرف مردوں اور عورتوں کی جہالت نے زندگی کے ہر شعبے میں ابتری پھیلا رکھی ہے دوسری طرف غلط تعلیم و تربیت نے رہی سہی قومی شرافت کا بھی خاتمہ کر دیا ہے۔

بدرالنساء۔ (عابدہ کی طرف بہ نظر استحسان دیکھتی ہے)
دادا حضرت نے غدر کے حالات بچشم خود دیکھے تھے وہ...

صوفیہ۔ (بات کاٹ کر) امی جان! خدا کے لئے اسے غدر نہ کہیے جنگ آزادی کہیے۔

بدرالنساء۔ ہاں دادا مرحوم بھی یہی کہتے تھے۔ لیکن ہم نے تو سب کو غدر ہی کہتے سنا ہے۔

صوفیہ۔ اس لئے کہ امی دنیا نے اس کشمکش کو انگریز کی نظر سے دیکھا ہے۔

عابدہ۔ ہاں بہن! انگریزی نظر سے ہم نے کس چیز کو نہیں دیکھا ہے؟

. . . اللہ جانتا ہے سعیدہ! تم نے بات ایسی کہی ہے کہ جی چاہتا ہے بلائیں لے لوں۔

صوفیہ۔ (مسکراکر) تسلیم! آپ کی ستائش گری کی ممنون ہوں۔ باقی حقیقت یہی ہے۔

عابدہ۔ غدر کے لفظ پر تمہارا چراغ پا ہو جانا نہایت مبارک ہے۔ کاش ہم اپنی تعلیم و تربیت نیز قلب و نظر پر خارجی تسلط کو بھی اسی نظر سے دیکھتے۔

صوفیہ۔ اے لو! تو پھر آپ نے حملے شروع کر دیئے ہیں۔

عابدہ۔ (مسکراکر) نہیں بہن یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے۔

صوفیہ۔ (پیشانی پر شکن پیدا کر کے) یہ آپ کے منطقی شگوفے ہیں۔

عابدہ۔ (مسکراکر) تو اس کو کیا کیا جائے کہ تمہاری نظر میں شگوفے ہی لیے ہوئے ہیں۔

بدر النساء۔ (بے چینی سے) یہ بیچ بیچ میں جو تم بحث چھیڑ دیتی ہو، میرا قصہ رہا جاتا ہے۔ خیر تو مرحوم اس قوم کے زوال کی دردناک داستان سناتے اور آبدیدہ ہو جاتے۔ مرحوم کہتے جان و مال کی تباہی کا ذکر نہ کرو۔ اس متاع عزیز کے لٹنے کا غم کرو جو صدیوں کی پونجی تھی۔ ہماری پرانی درسگاہوں کی تباہی سب سے بڑی مصیبت تھی جو قوم پر نازل ہوئی۔

عابدہ۔ جی ہاں خالہ جان! یہ اساتذہ اور علماء پر انگریزی تسلط کا

ظلم واستبداد اور آخران کی جلاوطنی دراصل نونہالان قوم
کو زندگی کے سوتوں سے منقطع کرنے کے منصوبے تھے۔

بدر النساء۔ ہاں بیٹی! اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تعلیم تعلیم نہیں رہی۔
ایک طوفان برپا ہے۔ اسی لئے تو اس فتنے کے زمانے میں
جاہل رہنا ہی بہتر ہے۔

صوفیہ۔ امی! آپ نے تعلیم کا بس ایک ہی پہلو دیکھا ہے۔ کہاں
پرانی تعلیم اور جاہلیت کا تمدن اور کہاں تمدن کا بے
پایاں پھیلاؤ۔ اب دنیا ایک دوسرے سے قریب ہوتی
جارہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ علم کے ذخیرے نسلوں کی
در دب میں ہم تک پہنچ رہے ہیں۔ اب انسان آسمانوں کی
تسخیر کی سوچ رہا ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

بدر النساء۔ بیٹی! میں یہ جاہلیت، تمدن اور تسخیر خاک نہ سمجھ سکی۔

عابدہ۔ (صوفیہ سے)
خالہ جان کا مطلب یہ ہے کہ اس مخلوط تعلیم و تربیت نے ساری
ابتری پیدا کر رکھی ہے۔ ورنہ ارشادِ نبوی سے کس مسلمان کو
انکار ہے کہ ہر کلمہ گو پر تعلیم فرض ہے۔ اس تصور نے ہمارے
اسلاف کی کاوشیں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔

صوفیہ۔ (استہزا آمیز ہنسی کے ساتھ)
اچھا تو پھر آپ نے وہی پرانی اسلاف کی کہانی شروع کردی

آپ دورِ جدید میں ترقی پسند نظریہ کی طرف آرہی ہیں یا رجعت پسندی کی طرف جارہی ہیں ؟

عابدہ ۔ (مسکراکر) صوفیہ ! تم الفاظ کے دام میں نہ آجایا کرو۔ یہ جادو صرف خام کاروں پر چل سکتا ہے ۔ ماشاء اللہ تم تو پختہ کار بننے کی دعویدار ہو ۔

صوفیہ ۔ (ہنستی ہے) شکریہ ! لیکن باجی آخر آپ یہ سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں کہ حال ہمیشہ مستقبل کا رخ کرتا ہے ۔ ماضی میں داخل نہیں ہوتا ۔

عابدہ ۔ اے تو آخر تم نے فلسفے میں یہ بھی تو پڑھا ہوگا کہ حقائق ابدی کو اس پیمانے سے نہیں ناپا جاسکتا ۔

صوفیہ ۔ (آواز میں قوت پیدا کرکے)

اس بندی نے پڑھنے کو سب کچھ پڑھ لیا ہے لیکن باجی میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تاریخ انسانی کا بہت پرانا باب زمانہ حاضر کی تاریخ نہیں بن سکتا۔ حال کو ماضی کا رنگ دینا عقلاً محال ہے یہ زندگی نئے ممکنات کو لیکر ابھر رہی ہے ۔ فرسودہ زندگی کو اس کے لئے جگہ خالی کردینی چاہیئے ۔ یہی قانون فطرت ہے ۔ تاریخ عالم کے کہنہ ابواب کو کتاب زیست سے بالکل حذف کردینا چاہیئے کہ زندگی سے ان کا اب کوئی تعلق نہیں رہا ۔

عابدہ ۔ (مسکرا کر) صوفیہ! تمہارے یہ خیالات جو نہایت خوش آہنگ ہیں مستعار بھی ہیں، اسی لئے ان میں بے ربطی سی پائی جاتی ہے ۔ یہ کسی اور کا کرشمہ ہے ۔

صوفیہ ۔ (قہقہہ لگاتی ہے)
بجا فرمایا آپ نے لیکن باجی! یہ بھی خوب یاد رہے کہ اس کرشمے کا ظہور عنقریب میں آپ میں بھی پاؤں گی ۔ بھائی جان ......

عابدہ ۔ (چہرے کا رنگ قدرے متغیر ہو جاتا ہے ۔ بات کاٹ کر)
تو کیا تم انسانی تاریخ کو فراموش کر دینا چاہتی ہو؟ حالانکہ تاریخی حالات انسانی کردار کے آئینہ دار ہیں جو انسانی صلاحیتوں کو روبہ عمل آنے کے امکانات کا عملی نقشہ ہماری نظروں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ ہم تجربے کی مزید کاوش سے بچ جائیں، اور ہزاروں برس کے انسانی تجربات سے فائدہ اٹھائیں ۔ گذری ہوئی نسلوں کے حالات موجودہ اقوام کی زندگی کی کڑیاں ہیں کہ ہمارا پیش رو انسان، زندگی کے مسلسل ردّوبدل سے ہیں پیدا کر سکا ۔ اب جو ہم سابقہ حالات سے خود کو علیحدہ کر لیں گے تو گویا ہم اپنی کتاب زیست کے وہ ابواب حذف کر دیں گے جو ماضی سے حال تک تواتر کے ساتھ نمودار ہو کر ہمارے کردار کا صحیح نقشہ پیش کرتے رہیں ۔

انسانی زندگی کے اس طویل سلسلے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

صوفیہ۔ (خوب صورت چہرے کو بنا کر)
آپ کی منطق نہایت پیچیدہ ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ چودھویں صدی کا انسان پہلی صدی کی طرف پلٹ رہا ہے۔

عابدہ۔ ہماری بڑی بدبختی تو یہی ہے کہ ہم ماضی، حال اور مستقبل کی حقیقت کو سمجھنے سے معذور ہو گئے ہیں اسی لیے زمان و مکان کا مسئلہ قوم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا۔

صوفیہ۔ (تیز ہو کر) کیسا زمان اور کیسا مکان! آپ کا زاویۂ نظر ہی نرالا ہے۔ یہ آپ فلسفے کی زبان میں کیوں بات کر رہی ہیں۔

(عابدہ مسکراتی ہے اور صوفیہ کی کتابوں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)

عابدہ۔ (مسکرا کر) ہاں بہن! خفا نہ ہونا ..... فلسفہ تو تمہارا نہایت پسندیدہ اور خاص مضمون رہا ہے۔ یہ تمہاری کتابوں میں مجھے بالِ جبریل نظر آ رہی ہے؟

صوفیہ۔ (کچھ پریشان ہو کر) یہ لیجئے آپ تو میرا امتحان لینے لگیں...

عابدہ۔ (مسکرا کر) ٹھہرو نہیں بہن صوفیہ! میں اپنی مشکل حل کرنا چاہتی ہوں۔

(صوفیہ مسکراتی ہوئی عابدہ کو کتاب دیتی ہے عابدہ کتاب کھولتی ہے۔)

اچھا بتاؤ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

صوفیہ۔ (چہرہ سے خفت مٹانے کی کوشش میں مسکرا دیتی ہے) باجی! میں اس کا مطلب تو بیان نہ کرسکوں گی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے اس شعر کو امتحانی نقطۂ نظر سے ضروری خیال نہیں فرمایا۔ ایک لکچر زمان و مکان کی حقیقت پر ضرور دیا تھا۔ کیا بتاؤں موضوع کو کچھ اس طرح الجھا دیا کہ یہ بحث جماعت بھر میں کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم سب کا متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ پروفیسر صاحب اس مسئلے کو خود بھی نہیں سمجھے۔

عابدہ۔ (مسکرا کر) اے لو! اب تم پروفیسر صاحب کو الزام دینے لگیں۔

صوفیہ۔ الزام کیا دینے لگی باجی، حقیقت یہی ہے۔

عابدہ۔ (ہنستی ہے)

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا شنہ کار طفلاں تمام خواہد شد

صوفیہ۔ خیر تو سوال یہ ہے کہ سائنس کی سلطانی سے فرار ہو کر جاہلیت کے ماحول میں پناہ لینا انسانی فلاح کے لئے کہاں تک مناسب ہے۔

عابدہ۔ یہ جاہلیت کے ماحول کا تعیّن اس سے زیادہ مشکل ہے۔

تم نے سائنس کی سلطانی کو جاہلیت کی ضد قرار دیا ہے۔ میں ان دونوں میں ربط نہ سمجھ سکی۔ سائنس کی حقیقت شاید تمہاری نظر میں بھی یہی ہے کہ یہ قانون فطرت کی ماہیت ہے جو انسان کی تسخیری قوتوں کو آشکارا کر رہی ہے۔ سائنس کی ترقی انسان کی صلاحیت اور اس کی مساعی کے بے پایاں امکانات کو ظاہر کرتی ہے اور خالق کائنات کی کبریائی اور اس کی لاتعداد نعمتوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ ابھی انسان کی نظر نے دیکھا ہی کیا ہے۔ تم نے شاید مذہبیت کے دور کو جاہلیت کا دور قرار دیا ہے۔

صوفیہ۔ جی ہاں! آپ کا خیال صحیح ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

عابدہ۔ جی نہیں، حقیقت اس کے برعکس ہے اگر تعلیم کی قدریں مصنوعی نہ ہوں تو ہر سلیم الطبع پر یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ فطرت کی تسخیر اور کائنات کے رموز کا انکشاف خدائی قوتوں کو آشکارا کر رہا ہے۔ سائنس کی تحقیق در اصل ایک حکیم مطلق کی حکمت کا سراغ ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ایک عبادت ہے کیونکہ کائنات کی تسخیر اور تحقیق ہماری نظروں سے غفلت کے پردے اٹھاتی جا رہی ہے۔ ہم طبعی سائنس میں ایک قسم کی روحانیت پاتے ہیں۔

صوفیہ۔ (چہرے سے بےچینی کا اظہار کرتے ہوئے) نانا جی! اب آپ نے اصلی بحث کو چھوڑ کر فلسفہ کا مسئلہ چھیڑ دیا ہے اصل بحث نظریۂ تعلیم

کی تھی ۔ میرا مدعا یہ تھا کہ اس انقلابی دور میں جب نئی نئی قوتیں ابھر رہی ہیں اور زندگی کی نئی قدریں قائم ہو رہی ہیں، کائنات کی تسخیر کا سامان اپنی پوری قوت سے ہو رہا ہے تو اس ماحول میں آپ کے نظریۂ تعلیم کی یا ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی گنجائش کہاں ہے۔ یہ زمانہ آپ کی چلتی پھرتی یونیورسٹی کا نہیں ہے۔

عابدہ۔ (ہنستی ہے)
بات یہ ہے کہ زندگی کے مختلف مسائل کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دینے سے تمہارے ذہن میں انتشار پایا جاتا ہے۔ تم میری بات ذرا غور سے سنو، جواب دینے کی فکر میں نہ رہو۔

صدیقہ۔ (ہنس کر) اچھا تو فرمائیے کچھ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ آپ کے مواعظ دلچسپی سے خالی نہیں ہوتے۔

عابدہ۔ (مسکرا کر) تم نے دلچسپ جانا یہ تمہاری عنایت ہے۔ اور میں ممنون ہوں۔ میری گفتگو نے تم پر اتنا بھی اثر کیا تو بہت ہے۔ اچھا سنو! تعلیم کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ تعلیم کا بنیادی مقصد کبھی تنہا یہ نہیں رہا ہے کہ طالب علم باکمال سائنس داں، کامیاب فن داں، بے مثل سپاہی، بے عدیل مصنف وغیرہ کیونکر بنے۔ معلم کو دیکھنا یہ ہے کہ متعلم یہ سب کچھ بننے سے پہلے کامیاب انسان کیونکر بنے۔ اس کی انسانیت جملہ شعبہ ہائے زندگی کو

احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہاں کائنات اس کے لئے اپنی تسخیر کے سامان پیش کر رہی ہے وہاں ضروری ہے کہ ارباب حکمت کی رہنمائی اسے ان کے استعمال کی خیری راہوں سے بھی آگاہ کرے۔ فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ بلند اخلاقی عمارت پر حلیہ علوم کے چراغ روشن کئے جائیں۔

صوفیہ۔ آپ نے انسان کے جسم کی آسائش پر اس کی روح کی غایت کو غالب کر دیا ہے۔ انسان کی کل کائنات اس کی روح ہی تھا۔

عابدہ۔ (مسکرا کر) جی ہاں بی صوفیہ! لیکن ساتھ ہی اس کی کل کائنات اس کا پیٹ بھی تو نہیں ہے۔

صوفیہ۔ (ہنستی ہے) لیکن باجی! زمانہ تو سب کچھ پیٹ ہی کی خاطر کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ اور آپ کو ابھی زمانے کا ساتھ بھی دینا ہے۔

عابدہ۔ تم یہ کیوں نہیں مانتیں کہ یہ زمانے کی غلط بینی ہے۔ زندگی کے تقاضے کئی ہیں۔ ان میں ایک معاشی تقاضا بھی ہے اور نہایت اہم ہے۔ زندگی کے جملہ تقاضے پورا کئے جانے کے لئے ہیں اس کے لئے خالق کائنات نے نہایت صحت مند اور معتدل راہ دکھائی ہے اگر ہم اصلاحی نظر پیدا کریں تو زندگی کا انتشار دور ہو جائے۔

صوفیہ (آنکھیں پھاڑ کر پیاری حیرت سے عابدہ کی طرف دیکھتی ہے)

ماشاءاللہ! اس انقلابی دور میں اسلام کے حسن و جمال کا قصیدہ
پڑھ دینا کافی نہیں ہے۔ اس دعوت نظارہ سے پہلے اسلام
کی کوئی کافرادا پیش فرمائیں تب تو ہم جانیں۔

(صوفیہ فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہے۔ بدرالنساء کے چہرے کا رنگ
بدل جاتا ہے۔ وہ صوفیہ کی طرف عتاب آمیز نظروں سے دیکھتی ہے)

عابدہ۔ (صوفیہ سے)

الفاظ کی ترکیب سے قطع نظر بات تم نے معقول کہی۔ لیکن تمہارا
بھی تو فرض ہے کہ تم اپنے اندر کلیمی نظر پیدا کرو۔

بدرالنساء۔ (صوفیہ سے)

بیٹی! کافرادا کی ترکیب ہر چند کہ خوش آہنگ سہی تمہاری
زبان سے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

صوفیہ۔ آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟ ..... خدا نہ کرے ...

بدرالنساء۔ (غصہ سے بیتاب ہو جاتی ہے)

اچھا بیٹی اچھا! خدا تمہیں نیک توفیق عطا فرمائے۔ اسلام میں
کافرادا کیا معنی؟ معاذاللہ! اسلام اور کافرادا!

عابدہ۔ (مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کرتی ہے)

خالہ جان! آپ خفا نہ ہوں۔ اس کافرادا کو نہ اسلام سے تعلق
ہے نہ کفر سے۔

(صوفیہ ہنستی ہے)

بدرالنساء۔ تم نہ بولو عابدہ! (فکرمند چہرہ بناکر)
کافرادا! الٰہی توبہ!

صوفیہ (والدہ کی خفگی سے کچھ پریشان ہوکر) امّی! آپ ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھیں۔

بدرالنساء۔ بیٹی، تم بات ہی ایسی کرتی ہو۔ تم اب بگڑنے کا حق بھی مجھ سے چھین لو۔

صوفیہ (عابدہ کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے)
اب میں آپ کو کیا سمجھاؤں؟

بدرالنساء۔ ہاں بیٹی! ہم پرانے لوگ ان باریکیوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔
تم تعلیم یافتہ ہو۔ یہ تعلیم کے ثمرات ہیں۔

صوفیہ۔ خیر، ہم اپنی ہنگامت لیں گے۔
(بدرالنساء ٹھنڈی سانس بھرتی ہے سب خاموش ہوجاتی ہیں)

مجلسِ دوم

منظر اوّل

[لیاقت منزل۔ رات کے دو بجے یکایک شور و غل مچتا ہے۔
گھر کے جملہ افراد جاگ اٹھتے ہیں۔ لیاقت حسین اور اختر پریشان ہوکر
برآمدے میں نکل آتے ہیں۔ وہ ہنگامے کی چیخ پکار کی طرف کان لگائے
تھوڑی دیر تک خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ پھر مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔]

لیاقت حسین۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین نے پھر ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔

اختر۔ اس کے آثار کل ہی سے پائے جاتے تھے۔

بندوقوں کی آواز سے فضا گونج اٹھتی ہے نجم النساء اور عابدہ
نہایت بدحواس اور پریشان داخل ہوتی ہیں)

نجم النساء۔ یا اللہ! یہ کیسا شور ہے۔ دل ہلا دینے والے نعرے ہیں۔

لیاقت حسین۔ وقتی ہنگامہ ہے۔ دب جائیگا۔

(عابدہ اور نجم النساء مونڈھوں پر بیٹھ جاتی ہیں)

نجم النساء۔ (بندوقوں کی آواز سنکر سہم جاتی ہے)
سنا نہیں؟ گولی چل رہی ہے۔ فوج موقع پر ضرور پہنچ گئی ہوگی

اختر۔ لیکن یہ روگ پولیس اور فوج کے بس کا نہیں ہے لاکھوں
کروڑوں دیوانوں کو دنیا میں کون سنبھال سکتا ہے؟

نجم النساء۔ (پریشان ہو کر)
تو آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔؟

لیاقت حسین۔ خدا پر بھروسا کرنا چاہیئے۔

نجم النساء۔ کون مسلمان ہے جو خدا پر بھروسا نہیں کرتا؟ مگر جان بچانا
بھی تو فرض ہے۔

لیاقت حسین۔ ہاں اگر بچا سکیں۔

(شور و غل بڑھتا جاتا ہے)

نجم النساء۔ (گھبرا کر) کیسے دل ہلا دینے والے نعرے ہیں ... خدا
خیر کرے۔

لیاقت حسین۔ گھبراؤ نہیں۔ اللہ مددگار ہے۔

(دور شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ اور فضا روشن ہو جاتی ہے۔
سب سہمے ہوئے ٹکٹکی باندھ کر شعلوں کی طرف دیکھتے ہیں۔)

نجم النساء۔ (چلاتی ہے)۔ آگ لگ گئی اس زندگی کو بدبخت مخلوق،
زندگی کس آگ سے ہولی کھیل رہی ہے۔

(لیاقت حسین چھوٹی میز کا سہارا لئے ہوئے دونوں ہاتھوں
سے اپنے سر کو تھام لیتے ہیں)

اختر۔ اس بے بسی کے خیال سے بھی انسان کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

لیاقت حسین۔ دل کو مضبوط کرنا چاہئیے۔

نجم النساء۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) آپا جان اور پیاری صوفیہ کا کیا حال ہوگا! یا اللہ یہ کیسی پریشانی ہے؟ خدا اپنا فضل فرمائے۔

اختر۔ (اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کر) وہ علاقہ بالکل غیر محفوظ ہے۔ معلوم نہیں کیا گذر رہی ہوگی..........

(ٹھنڈی سانس بھر کر)

کوئی پریشانی سی پریشانی ہے۔

نجم النساء (لیاقت حسین کی طرف دیکھ کر)

بولتے کیوں نہیں؟ خاموش کیوں ہو گئے؟ اب کیا ہوگا؟

لیاقت حسین۔ (آواز کو قابو میں کرتے ہوئے)

کیا ہوگا؟ کچھ نہیں...... خدا کا فضل ہونا چاہئیے۔

نجم النساء۔ فضل ہوتا تو نظر نہیں آتا؟

لیاقت حسین۔ ڈرتی کیوں ہو، اگر اللہ کو یہی منظور ہے تو سبھی کو ایک نہ ایک دن آنا ضرور ہے۔

نجم النساء۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) آنا ضرور ہے مگر ایسا بھی کیا آنا۔

(سینہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے) یا اللہ! یہ دل پھٹ نہ جائیگا۔

(شعلے دبنے لگتے ہیں اور ہنگامہ فرو ہوتا معلوم ہوتا ہے)

عابدہ۔ امی! خدا نے چاہا تو اب ہنگامہ فرو ہو جائیگا۔

نجم النساء۔ آمین! بیٹی! خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔

اختر۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوج موقع پر پہنچ گئی ہے۔

(شور وغل بڑی حد تک موقوف ہو جاتا ہے سب اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔)

نجم النساء۔ یا اللہ! کیا زمانہ آگیا ہے۔ یہ دور دنیا کے لئے بڑی پریشانی اور انتشار کا دور ہے۔

عابدہ۔ اب لوگ غلامی کی فارغ البالی کو یاد کر کے رو رہے ہیں۔

اختر۔ زندگی کو اس رونے سے کب فرصت نصیب ہوئی؟ پہلے غلامی کو رو رہے تھے، اب آزادی کو رو رہے ہیں۔

نجم النساء۔ میاں سچ پوچھو تو یہ زندگی ہی وبال جان بن گئی ہے۔

اختر۔ اس لئے کہ انسان کے درد کی دوا نہ غلامی میں ہے نہ آزادی میں۔ زندگی کو نئی قدروں کی ضرورت ہے۔ دنیا خیر کی راہ بھلا چکی ہے اس کی تخریب کے بعد ہی تعمیر کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

نجم النساء۔ کیوں؟ اللہ کے لاکھوں بندے اب بھی خیر کی راہ پر گامزن ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ اللہ کی مخلوق پر ظلم و ستم ان کا دستور نہیں ہے۔ جس دھرم میں چیونٹی کی جان لینا بھی پاپ ہے اس کے ماننے والوں کے لئے انسان کا خون بہانا یقیناً مہا پاپ ہے۔ ابھی دنیا اللہ والوں سے خالی نہیں ہوئی۔

اختر۔ (طعن آمیز مسکراہٹ کے ساتھ)

لیکن یہ آگ جس میں معصوم جل رہے ہیں انہیں اللہ والوں کی

لگائی ہوئی ہے۔ دنیا میں امن و امان کی خاطر اس مذہبی ندگی کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے۔

لیاقت حسین۔ (چہرے سے اندرونی بے چینی ظاہر ہوتی ہے)

تمہارا یہ خیال حالات کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے یہ شیطانی آگ مذاہب کے اختلاف کی بنا پر کبھی نہیں سلگائی گئی۔

اختر۔ لیکن آج تو یہ سب کچھ مذہب ہی کے نام پر ہو رہا ہے۔

لیاقت حسین۔ اب دنیا میں مذہب کہاں رہا؟ مذہب کا نام البتہ باقی ہے عیسائی تعلیم صفحات قرطاس میں بند ہو کر سسکیاں لے رہی ہے۔ اسلام بھی قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے۔ ہندو دھرم کی صلح پسند تعلیمات بھی طاق نسیاں کی زینت بن کر رہ گئیں۔ یہودیت نے اپنا گلا آپ گھونٹ لیا۔ اب اللہ کا حکم کہیں جاری نظر نہیں آتا۔ "عیسائیت خطرہ میں ہے" "اسلام خطرے میں ہے" "اشتراکیت کا دیوتا تمام مذاہب کو نگلا جائیگا" یہ سب منافقین کے نعرے ہیں اور یہ بھی فقط دنیا کی خاطر ہے۔ دین کا یہاں گذر کہاں؟ 'اللہ اکبر' اور 'زندہ باد' کے ہنگامے ہیں۔ انسان کی ان عالمی سرگرمیوں میں مذہب کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ شانتی اور سلامتی سے دل بیزار ہیں۔ اسلام کا سپوت، ہندو دھرم کا فرزند، عیسائیت کا پرستار، یہودیت کا دلدادہ سب کے سب فقط ایک ہی بت کے پجاری ہیں۔ جس کا نام "بہیمیت" ہے۔

ان مختلف ملتوں سے اس واحد مذہب کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے

اختر ۔ یقیناً زندگی کو نظامِ کہن کے خاتمے کے بغیر کبھی چین نصیب نہ ہوگا ۔

لیاقت حسین ۔ یہاں کہن اور جدید کا سوال نہیں ہے ۔ زندگی کو ایک ایسا مذہب عطا کرنے کی ضرورت ہے جس کے آغوش میں دنیا ڈراؤنے خوابوں کی ہیبت سے پھر کبھی چونک کر نہ اٹھے ' ننھا معصوم روٹی کے لئے پھر کبھی نہ بلبلائے ' مادری شفقت کا طوفان اپنے جگر گوشے کے آلام و مصائب پر پھر مد و جزر سے دوچار نہ ہو ... ایسا مذہب جو جسم کو سلامتی اور روح کو شادمانی کا ہدیہ پیش کرے ۔

اختر ۔ اس کے لئے افراد کے ضمیر میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے ۔

لیاقت حسین ۔ یہ نہیں کہ دنیا میں اس انقلاب کے لئے امن پسند نفوس کی کمی ہے ۔ ضرورت ہے کہ ان نفوس کو متحد ہو کر جماعت کے افراد کی شرارت انگیز ذہنیت اور بربریت پر غالب آجانا چاہیئے اصل میں قوم کو سنجیدہ مزاج اور صداقت پسند طبیعت عطا کرنا جماعت کے صالح طبقے کا نہایت برگزیدہ اور لازمی فریضہ ہے ۔

نجم النسا ۔ لیکن اس وقت تو ظلم اور انتقام کی آگ سینوں میں سلگ رہی ہے ۔ اس آگ کو بجھانا فی الحال ممکن نظر نہیں آتا ۔

لیاقت حسین ۔ اس آگ کو صرف مذہب کی پاکیزہ تعلیم ہی بجھا سکتی ہے اگر ہم

مذہب کی روح کو سمجھ سکیں۔ انسان کی ظالمانہ ذہنیت اور یہ خیال کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے دیا جائے نہایت خطرناک ہے۔ اس کی مثال کسی مذہب کے علم بردار کی زندگی میں نہیں ملتی۔ "رحمۃ للعالمین" کی زندگی آلام و مصائب سے پر ہے مگر جب کامرانی نے قدم چومے اور سلطانی استقبال کے لئے آگے بڑھی تو ہادیٔ عالم نے "لا تثریب علیکم الیوم" کی صدا دی۔ دشمنوں کی گردنیں اس امن کی تلوار کے سامنے جھک گئیں۔ اصل میں انسان کے اخلاق اور بنی نوع انسان کے ساتھ اس کا مشفقانہ اور فیاضانہ سلوک ہی دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہماری زندگی میں بانیانِ دین کے اسوۂ حسنہ کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ آج وہ زمانہ ہے کہ ہر ننگ انسانیت جو دھرم اور مذہب کے نام پر معصوم حلق پر چھری پھیرنے کے لئے مستعد ہے اللہ کی خوشنودی کا اہل اور جنت کا دعویدار بنا ہوا ہے۔

نجم النساء۔ یا اللہ! یہ مذہب کی کیسی ہیبت ناک خون آلود تصویر دنیا کی نظر نے دیکھی ہے۔

لیاقت حسین۔ اصل میں اللہ کے راستے اور نفس کے راستے میں امتیاز کے شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

[اچانک شور و غل کے ساتھ بموں کے دھماکوں کی دہشت انگیز آواز سنائی دیتی ہے۔]

سے سہم جاتے ہیں۔ نجم النساء گھبرا کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتی ہے
اور آنکھیں بند کر لیتی ہے۔]

نجم النساء۔ (آنکھیں کھولتی ہے) یا اللہ! کیا پھر آتش فشاں پھٹ پڑا؟
شاید نظم و ضبط کا بند ٹوٹ چکا ہے اس طوفان میں اب زندگی
کو کہاں پناہ ملے گی؟

عابدہ۔ (تسلی دیتے ہوئے) امّی! یہ علاقہ زیادہ محفوظ ہے۔ آپ
کیوں پریشان ہوتی ہیں؟

نجم النساء۔ اس وقت کوئی علاقہ محفوظ نہیں معلوم ہوتا خدا نہ کرے بیٹی!
کچھ بلاؤں کا رخ ادھر ہی کو نظر آتا ہے۔

لیاقت حسین۔ (نجم النساء سے)
تمہاری طبیعت کی بے چینی تمہیں ضرورت سے زیادہ پریشان
کئے ہوئے ہے۔ تمہیں خوف کو دل سے دور کر دینا چاہیئے۔
اللہ مالک ہے۔

نجم النساء۔ یا اللہ! آج دل کیوں اتنا دھڑک رہا ہے؟ سرِ شام ہی سے
طبیعت اداس اداس معلوم ہوتی ہے۔

(فضا آگ سے روشن ہو جاتی ہے)

نجم النساء۔ (آگ کی طرف دیکھ کر چلاتی ہے) آگ! آگ۔

لیاقت حسین۔ (آسمان کی طرف نظر کر کے آہستہ سے) نعوذ باللہ!

نجم النساء۔ آگ لگ گئی زندگی کو! زندگی پھونک دی گئی۔ اجڑ گئی زندگی۔

(عابدہ اور اختر آنکھیں پھاڑ کر آگ کی طرف دیکھتے ہیں۔)

لیاقت حسین۔ (ٹھنڈی سانس لیکر)
سلگنے دو زندگی کو۔ ڈرتی کیوں ہو؟ زندگی اللہ کے حکم کے بغیر چھینی نہیں جا سکتی۔

نجم النساء۔ (آنکھوں سے آنسو جاری ہیں)۔
ڈریں گے نہیں تو کیا کریں گے۔ کونسا دل ہے جو سینے میں دہل نہیں رہا ہے۔ کونسی آنکھ ہے جو رو نہیں رہی ہے۔ ہاتھ پاؤں سارا جسم تو لرز رہا ہے۔ سارا وجود بھونچال میں گھر گیا۔ (عابدہ اور اختر کی طرف دیکھکر) ان نونہالوں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ قربان گئی میں اپنی عابدہ اپنے اختر کے یا اللہ! انہیں تو اپنے حفظ و امان میں رکھیو۔ یہ بڑھیا جی کر کیا کرے گی؟ یا اللہ تو ہی نگہبان ہے۔

[عابدہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ لیاقت حسین بیٹی کے چہرے کی طرف نظر کرتے ہیں۔ محبت پدری کا طوفان چہرے پر نمودار ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اٹھتی ہوئی سرد آہ کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں]

لیاقت حسین۔ بیٹی عابدہ! اللہ پر بھروسا کرو۔

عابدہ۔ ابا جان! میں تو فقط امی کی پریشانی سے آزردہ ہو رہی ہوں۔

(نجم النساء سے:) امی! اللہ مالک ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔

(نجم النساء اپنی جگہ سے اٹھ کر عابدہ کو گلے لگا لیتی ہے)

نجم النساء (آنکھوں سے آنسو جاری ہیں)
بیٹی! تیری ماں تجھ پر قربان۔ خدا تجھے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

عابدہ (رخساروں سے آنسو ڈھلکنے لگتے ہیں)
امی جان! آپ روتی کیوں ہیں؟ اللہ مسبب الاسباب ہے۔

لیاقت حسین (دل بھر آتا ہے اور آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ طبیعت کو سنبھالتے ہوئے نجم النساء سے)
یہ کیا کرتی ہو؟ آخر . . . .

[نہایت تیز رفتار موٹر پھاٹک کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔
سب پریشان ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ موٹر آگے بڑھتی ہے اور برآمدے کے سامنے آکر رک جاتی ہے۔ ایک شخص موٹر سے اترتا ہے]

لیاقت حسین — ہا! آپ ہیں، جناب مدن گوپال صاحب! آپ کی غیر متوقع آمد نے ہم لوگوں کو ڈرا دیا۔

(عابدہ اور نجم النساء مکان میں چلی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر گوپال آگے بڑھ کر لیاقت حسین اور اختر سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ سب مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

ڈاکٹر مدن گوپال۔ (لیاقت حسین سے) آپ غیر متوقع کے بجائے متوقع فرمانے

تو مجھے زیادہ مسرت ہوتی۔

لیاقت حسین۔ بھائی! یہاں کس بات کا دماغ ہے
معاف کرنا۔

ڈاکٹر مدن گوپال۔ میں یہی تو دیکھنے آیا ہوں کہ آپ یہاں کس حال میں ہیں؟

لیاقت حسین۔ حال کیا پوچھتے ہیں؟ اللہ کو یاد کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مدن گوپال۔ ہم شام ہی سے طبیعت پریشان رہی۔ آخر نہ رہا گیا۔
ارادہ کر کے نکلا کہ جو ہو سو ہو پہنچ تو جاؤں۔

لیاقت حسین۔ یہ آپ کی محبت ہے۔ اس وقت آپ کی نوازش اور
زحمت فرمائی کا شکریہ ادا نہ کرنا بھی کفران نعمت ہے۔
حقیقت میں آپ کے خلوص کی قیمت زمین و آسمان کی
کل کائنات بھی نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر مدن گوپال۔ بھائی لیاقت! کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہو؟ نہ زحمت،
نہ نوازش۔ انسان دنیا میں جو بھی کرتا ہے اپنے دل کی
خوشی کا سامان کرتا ہے۔ میں اپنی بے چینی دور کرنے حاضر
ہوا ہوں۔

لیاقت حسین۔ کچھ سندر لال کا بھی حال معلوم ہو سکا؟

ڈاکٹر مدن گوپال۔ جی ہاں! آج ہی لاہور سے خط موصول ہوا ہے ان کا
ایک بیٹا تو مارا گیا۔ جان ان کی اور ان کے بیوی بچوں
کی بچ گئی۔ لیکن اس کے لئے ان کے عزیز دوست

اشتیاق حسین مرحوم کو جان دینی پڑی۔ خط پڑھ کر بڑا دکھ
ہوا۔ آج دن بھر دل پر وہی اثر لئے رہا۔

لیاقت حسین ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ بھائی مدن گوپال
یہ کیسے معلوم تھا کہ ہمیں یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔ دنیا
ایک عجیب حال سے گذر رہی ہے۔

(ہولناک چیخوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور چند نفوس
سڑک کے موڑ پر حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ سب پریشان ہوکر
اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

ڈاکٹر مدن گوپال ۔ رام رام۔ یہ قیامت قریب ہی آن پہنچی؟ اب یہاں
سے بھاگ نکلنا بھی مشکل ہو جائیگا۔ بھائی لیاقت جلدی
کرو۔ بیٹا اور بہن کو موٹر میں جلدی سوار کرو۔

(لیاقت حسین دوڑے ہوئے مکان میں داخل ہوتے
ہیں۔ اختر اور مدن گوپال مجمع کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے
ہیں۔ لیاقت حسین عابدہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے نمودار ہوتے ہیں)

لیاقت حسین ۔ (پریشانی سے) آپ لوگ موٹر میں سوار ہو جائیں
میں ابھی آتا ہوں۔

(لیاقت حسین کمرے کا رخ کرتے ہیں)

ڈاکٹر مدن گوپال (چلا کر) لیاقت! یہ کیا کر رہے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟
تمہیں صورت حال کا اندازہ نہیں ہوا، موٹر میں سوار کیوں

نہیں ہو جاتے۔ اور بہن کہاں ہیں؟

لیاقت حسین۔ (مڑکر مدن گوپال سے)

آپ لوگ بیٹھ تو جائیں ہم بھی پہنچتے ہیں۔

(لیاقت حسین چلے جاتے ہیں)

ڈاکٹر مدن گوپال۔ ارے توبہ! لیاقت حسین سب کی جان لیکر چھوڑیں گے۔

عابدہ۔ (نہایت پریشان ہوکر) امّی کو اختلاج شروع ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر مدن گوپال۔ ارے رام رام۔

(ٹھنڈی سانس لیکر آہستہ سے)

تب تو وہ آ چکیں۔ [اختر عابدہ اور ڈاکٹر مدن گوپال موٹر میں سوار ہو جاتے ہیں۔ موٹر حرکت کرتی ہے اور پھاٹک کی طرف رخ کرکے رک جاتی ہے۔ اچانک بندوق کی آواز کے ساتھ گولی موٹر کے لیمپ پر پڑتی ہے۔ ڈاکٹر مدن گوپال پریشان ہوکر بڑھتے ہوئے مجمع کی طرف دیکھتے ہیں جو اب بالکل قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ چلّاتے ہیں]

بھائی لیاقت! خدا کے لئے نکل چلو۔ بندۂ خدا کیا غضب کر رہے ہو۔

عابدہ۔ (آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، وہ چلّاتی ہے)

امّی! نکل چلئے ابا نکل چلئے۔

(بے چین ہوکر ہاتھ ملتی ہے)

یا اللہ۔

اختر ۔ (پریشانی میں جھنجھلا کر)
یہ بدبختی جان لیکر چھوڑے گی ۔

[ڈاکٹر مدن گوپال نہایت پریشان ہوکر مجمع کی طرف نظریں جمائے ہوئے ٹھنڈی سانس لیتے ہیں۔ اب مفسدین پھاٹک سے کچھ ہی فاصلہ پر ہیں۔ دو تین سنسناتی ہوئی گولیاں موٹر کے مختلف حصوں پر پڑتی ہیں۔ سب سہم جاتے ہیں۔

عابدہ کی اشک آلود نظریں ڈرائنگ روم کے دروازے پر لگی ہوئی ہیں۔ ایک اور گولی موٹر کے شیشے پر پڑتی ہے۔ شیشے کے ٹکڑے اڑکر ڈاکٹر مدن گوپال کے چہرے کو زخمی کر دیتے ہیں۔ وہ وحشت زدہ ہوکر چاروں طرف دیکھنے لگتے ہیں

ڈاکٹر مدن گوپال ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) نہ آؤ گے بھائی لیاقت ۔

عابدہ۔ (چیختی ہے) ابّا نکل چلیے۔ امّی نکل چلیے ۔

اختر ۔ (چلاتا ہے) نکل چلیے۔

(عابدہ موٹر سے اترنا چاہتی ہے۔ اب مفسدین موٹر کی طرف دوڑتے ہیں)

ڈاکٹر مدن گوپال ۔ (عابدہ سے)
بیٹھی رہو بیٹی! صبر کرو۔

[موٹر تیزی سے آگے بڑھ جاتی ہے "مارو پیٹو جانے نہ پائے" کے شور و غل میں عابدہ کی چیخیں گم ہو جاتی ہیں]

منظرِ دوم

[پناہ گزینوں کا کیمپ۔ سیکڑوں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں چراغ ٹمٹا رہے ہیں۔ کیمپ کے وسط میں ایک جھونپڑی میں چٹائیوں پر دو بستر بچھے ہیں۔ ایک پر اختر لیٹا ہے اور دوسرے پر عابدہ بیٹھی قرآن مجید کی تلاوت کر رہی ہے۔ اس کے سامنے ایک اینٹ پر چراغ جل رہا ہے۔ شیر خوار بچوں کے رونے کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دیتی ہے۔ اکبارگی دردناک آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ ایک خاتون کی آہ و بکا ہے جو بین کر کے رو رہی ہے۔ ہزاروں غموں کی روح اس ایک آواز میں سموئی ہوئی ہے۔ غم کی داستان کا یہ بیان فضا میں ارتعاش اور دلوں میں لرزش پیدا کر رہا ہے۔ اختر بے چینی سے بستر پر اٹھ بیٹھتا ہے اور بہت دیر تک سر بہ زانو بیٹھا رہتا ہے یہاں تک کہ اس خاتون کا رونا ہچکیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

عابدہ قرآن مجید کو بند کر کے جزدان میں رکھ دیتی ہے۔ اختر ٹھنڈی سانس لے کر عابدہ کی طرف دیکھتا ہے۔ عابدہ کی آنکھیں اشک بار ہیں اور اس کے چہرے سے شدید درد و کرب

کے آثار پائے جاتے ہیں]

عابدہ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر)

یا اللہ! زندگی کو یہ کیسا رونا نصیب ہو گیا!

اختر۔ اس خاتون کی آہ و بکا جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کئے دیتی ہے۔

عابدہ۔ آہ! اس کے حرمن امید پر کتنی بجلیاں ٹوٹ پڑیں؟

اختر۔ زندگی کی ان حرماں نصیب ساعتوں کی تپش جہنم کی آگ سے کم نہیں ہے۔ مایوسی کی یہ انتہا آب و گل والے آدم کی قوت برداشت سے باہر ہے۔

عابدہ۔ اس ایک آواز کے ساتھ کتنے دل رو رہے ہیں۔ سچ ہے غم غم کو تازہ کر دیتا ہے۔

اختر۔ اور جس کا غم بالکل تازہ ہو اس کے لئے قیامت کا سامان کر دیتا ہے۔

عابدہ۔ زندگی کی یہ خونیں داستان کیونکر بھلائی جا سکے گی؟ انسان کے سینے میں پتھر کا دل بھی ہو تو پانی ہو کر بہہ نکلے۔ یا اللہ! یہ بہتے ہوئے زخم کبھی خشک بھی ہو سکیں گے؟

اختر۔ کتنے مصائب کے نقشے نظروں میں ہیں اور کتنی غموں کی داستانیں سینوں میں۔ عزیزوں سے مفارقت کی گھڑیاں زندگی کی محبوبیت کو وحشت سے بدل دیتی ہیں۔

عابدہ۔ یہ مسلسل آلام و مصائب سہتے سہتے دل کچھ ایسا بیٹھا جا رہا ہے

کہ زندگی زندگی معلوم نہیں ہوتی۔ غم واندوہ کی گھٹائیں زندگی کے افق کو تیرہ تار کیئے ہوئے ہیں۔

اختر۔ دراصل یہ زندگی انسان کے لیئے ایک سانحہ بن کر نمودار ہوئی ہے۔ اور ہزاروں موت کے سامان بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔ نہ معلوم روز وشب کا چکر وجود وعدم کو آغوش میں لیئے زمانے کے چرخ کو کب تک گردش دیتا رہے گا؟

عابدہ۔ یہ زندگی کے مقدرات ہیں جن کے سامنے انسان کو سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ . . . .

(سرد آہ بھر کر) "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن"

اختر۔ تو اس طرح کا جینا ضروری کیوں ہے؟

عابدہ۔ اس لیئے کہ کوئی اور صورت سمجھ میں نہیں آتی۔

(پھر ایک دردناک آواز بلند ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ بچوں کے رونے کی آوازیں شامل ہو جاتی ہیں اور ایک کہرام مچ جاتا ہے۔)

اختر۔ کس منحوس ساعت میں اس خاک میں جان ڈالی گئی۔ یہ زندگی کا کھٹکا کن انگلیوں سے دبایا جارہا ہے کہ چلتی پھرتی مشینیں چشم زدن میں خاموش ہوتی جاتی ہیں۔ کیا فطرت کے عیار ہاتھوں نے کھیل تماشے کے لیئے ان مورتوں کو میدانِ زندگی میں لاکر رکھ دیا ہے کہ جب تک بازی گری جاری رہے

یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور جب تماشا ختم ہوتے تو کچھ نہ رہتے ؟
یہ قدرت کے ہاتھوں میں پتلیوں کا کام انجام دینے والا انسان
کس فریب زندگی میں مبتلا ہے !

عابدہ۔ زندگی انسان کے لئے غفلتوں کے حجابات کا یہ فریب فتنہ ہے جو حقیقت کو مستور کئے رہتا ہے۔ موت ہی اس فریب کاری کی پردہ دری کرتی ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے جو کبھی خبردار ہوا وہ زندگی کی لایعنی ہنگامہ آرائیوں سے گریزاں ہے اور جس کی نظر اس سراب کو آب حیات کا بحر بےکراں دیکھ رہی ہے وہ اس فریب کا شکار ہے۔ (سرد آہ بھر کر) یا اللہ! تیری سلطنت میں ہم سب تیرے فضل کے امیدوار ہیں۔

اختر۔ (تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) سبحان اللہ! اس غریب کا جذبۂ نیازمندی اب بھی اسی کی دستگیری کو ترس رہا ہے اور وہ عالمِ فریبِ درونِ پردۂ ہستیٔ زحمت کش تماشا بھی نہ ہو سکی۔

عابدہ۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی بے دست و پائی میں قدرت کی کارفرمائی کے بڑے اسباب ہیں۔

اختر۔ تو یہ کارفرمائی کی روشنی کب نمودار ہو گی ؟ اب تک تو زندگی کے افق پر مہیب تاریکیاں ہی منڈلا رہی ہیں۔

عابدہ۔ ان سیاہ بادلوں میں بجلیاں بھی ہیں جو تاریکی میں روشنی کا کام دیتی ہیں۔

اختر۔ لیکن یہ بجلیاں بھی موت کی دو دھاری تلوار کا کام کر رہی ہیں۔ زندگی کو موت کے آہنی پنجے سے کیونکر چھٹکارا نصیب ہو؟

عابدہ۔ جدائی کی ان گھڑیوں کو کون ٹال سکتا ہے اور موت کے شکنجے سے کس کو رہائی نصیب ہے! لیکن زندگی کی چہل پہل صرف اس سطحِ ارضی سے متعلق نہیں ہے۔

اختر۔ تو گویا سطحِ ارضی پر زندگی کی غایت ایک ناقابلِ حل معمابن کر رہ گئی ہے۔ زندگی کی بخشش اور اس کا دردناک خاتمہ سمجھ میں نہ آسکا۔

عابدہ۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ زندگی کے خاتمے کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاجِ عالم میں ذوقِ تجدید ودیعت کیا گیا ہے جو اجزائے آفرینش بظاہر زوال آمادہ نظر آتے ہیں۔

اختر۔ جی ہاں دل کی تسلی کی خاطر یہ ایک اچھا خیال ہے۔ لیکن اس کی بے مایگی زندگی کے شدائد میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ انسان کے سینے میں جب ایک ہوک سی اٹھتی ہے تو یہ خیالی قلعے خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں اور جگر پانی ہو کر بہہ نکلتا ہے۔ سطحِ ارضی سے آگے زندگی کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آسکتی نہیں

عابدہ۔ زندگی کا یہ بظاہر سانحہ گوشت پوست کی زندگی کے خاتمے کی

دلیل ضرور ہے۔ لیکن زندگی کی سرحدیں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں۔

اختر۔ ماشاءاللہ۔ تو پھر آگے نظر بھی تو نہیں آتیں۔ وجود کے خون کی پیاسی دنیا انسان کو سفاکی سے عدم کی راہ دکھا رہی ہے۔

باغِ ہستی میں مرغانِ چمن کی چہچہاہٹ اس قدر مختصر رہی کہ اس کی پرواز اور شاخِ نشیمن کے درمیان کے وقفے کا شمار بھی ممکن نہیں۔ موت کی تلوار بزمِ ہستی کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کے لئے برابر سونتی جا رہی ہے۔ قیصر و کسریٰ کے عشرت کدوں کو لوٹنے والی دستِ گدائے بے نوا کی کٹی کو بھی نہ بخش سکی۔ اس کی سلطانی کائنات کے چپے چپے پر کار فرما ہے۔ موت کی تباہی انسانی منصوبوں کی بلند بام عمارت کو منہدم کر رہی ہے۔ موت کی ہنگامہ آرائیاں قلزمِ آفاق میں زندگی کو ڈرا رہی ہیں۔ سفینۂ ہستی کی غرقابی کے لئے کیسی کیسی مہیب موجیں گود پھیلائے ہوئے ہیں! زمین کے زلزلے موت کے جھٹکے ہیں اور آسمان کی گرج موت کی پکار۔ سنسناتی ہوئی آندھیاں موت کے سفیر ہیں اور تباہ کن سیلاب موت کے دھارے۔ خود انسان کے نفس کی آمد و شد موت کا پیام ہے۔ ہر وہ نفس جو باہر ہو جاتا ہے اس کی واپسی کس کے بس میں ہے؟ زندگی کی شمع بجھتے کیا دیر! کس درد کی پکار ہے؟ معصوم پرندوں کی نغمہ آرائیاں حاصلِ زندگی پر ماتم کر رہی ہیں۔

(رومال سے منہ صاف کرتا ہے)

یہ بزم ہستی داد عیش دے کر موت کو بھلانے کی ناکام

کوشش ہیں اختر کیوں بہلاتے ہو؟ زندگی کے انجام سے چشم پوشی

انجام کو نہیں بدل سکتی۔

عابدہ۔ (اختر کے چہرے کا جائزہ لیتی ہے) لیکن موت کی خدائی ایسی

نہیں ہے جیسی تم کو نظر آ رہی ہے۔

اختر۔ توبہ اس موت کی خدائی کا حال نہ پوچھو۔

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت

دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

آہ! زندگی کا طلسم زندگی کو کس قدر پُر فریب بنا دیتا ہے۔

عابدہ۔ موت کی یہ ہمہ گیری موت کی خدائی کی دلیل نہیں ہے۔

اختر۔ جی نہیں! اس کی قدرت مطلقہ کے آگے زندگی کی پائیداری

ایک حباب سے زیادہ نہیں۔ تند موجوں کے تھپیڑے ناپائدار

ہستی کو عدم کی راہ دکھا رہے ہیں۔ اس کی فتح مندی شکست

حیات کو ظاہر کر رہی ہے۔

عابدہ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) استغفر اللہ! تو کیا موت کے تصرف

میں ساری خدائی آگئی؟ کیا انسان اپنے گرد و پیش موت

ہی موت دیکھ رہا ہے؟ ہماری نظر اس موت میں بھی زندگی

کے آثار پاتی ہے۔ سطح آب پر جب ایک بلبلہ کا وجود نکلتا ہے

تو ہزاروں پیدا بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک شاخ سے جہاں ہزاروں پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں وہاں لاکھوں زندگیاں پھوٹ رہی ہیں۔ ہزاروں کی موت کے ساتھ زمانے نے لاکھوں کو معرضِ وجود میں لا چھوڑا ہے۔ چٹانوں کے سینے پھاڑنے والا دانہ زندگی کی بے پایاں قوت کے ساتھ نمو کر رہا ہے۔ ہم موت کی ہمہ گیری میں ہر لمحہ تخلیق کی سربلندیاں دیکھ رہے ہیں۔

اختر۔ تو گویا تم نے زندگی کو موت کے خیال پر غالب کر دیا۔

عابدہ۔ جی ہاں، اس لئے کہ مشاہدہ بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ زلزلوں کی تباہیاں اور دریاؤں کے طوفان، بادلوں کی ڈراؤنی گرج اور بجلیوں کے مہیب تبسم، طوفانی آندھیاں اور سنسناتی ہوئی ہوائیں، یہ سب اور اس نوع کے ہزاروں آفاقی عذاب عالمِ وجود کو زیر و زبر کرنے میں نہایت درجہ بے باک ہیں۔ لیکن موت و حیات کی کشمکش میں ہم حیات ہی کو فتح مند پا رہے ہیں۔ لاکھوں سال کی اس خونریز جنگ نے کارخانۂ حیات کو برہم کرنے میں عملاً اپنی بے چارگی ہی کا ثبوت دیا ہے۔ زندگی کے ساتھ یہ امتحانی دور اپنے اندر ایک لازوال کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔ زندگی کی آہ و بکا اور نالہ و شیون اس دور کے عارضی اور سطحی مظاہر ہیں۔ کائنات

کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک زندگی کی آگ بھڑکا دی گئی ہے۔ ان شعلوں کو موت کی موسلا دھار بارش کبھی بجھا نہیں سکتی۔

(اس کے چہرے پر زندگی کے آثار چمک اٹھتے ہیں)

اختر۔ اس کے جواب میں میں صرف یہ کہوں گا کہ تم نے موت کی نہایت دلفریب تصویر کھینچی ہے۔ لیکن یہ محض دلفریب ہی ہے۔

عابدہ۔ جی نہیں! زندگی کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتی۔ زندگی کی نمو میں قدرت کی شان ربوبیت نے بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک نو وارد بچے ہی کو لیجئے کہ اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی زندگی کا وقفہ چند دنوں سے زیادہ نہ ہوگا۔ صرف ایک جذبۂ مادری کی تخلیق سے خالق کائنات نے جانوں کی حفاظت کا عدیم المثال سامان کر دیا ہے۔ ماں کی جانکاہیاں شفقت مادری کے اعجاز سے مسرت اور راحت میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ان آہنی دفاعات کو توڑنا موت کے لئے بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ زندگی کی ہر منزل میں ہم حفظ حیات کا بھی سامان پاتے ہیں۔

اختر۔ لیکن پھر بھی موت کی تباہیاں ہم دن رات دیکھ رہے ہیں۔ زندگی اس کے سامنے لرز رہی ہے۔

عابدہ۔ یہ تو ہم تا قیامت دیکھتے رہینگے۔ لیکن زندگی کی یہ وقتی شکست

اس کی پامالی کی دلیل نہیں ہے۔ حیاتِ سرمدی کی ناقابلِ تسخیر قوت انسان کی سرشت میں رکھی گئی ہے۔ اپنے وجود کے دوامی استحکام پر ایمان ظاہری اسباب کے طلسمی پردے اٹھا دیتا ہے۔

اختر۔ لیکن یہ زندگی کی سرمدی کیفیت اور اس کے استحکام کے خیالی احساس سے دلوں کو زندہ رکھنا بھی تو نہایت دشوار ہے

عابدہ۔ اسے خیالی احساس کہنا بھی تو بجا نہیں۔ اصل میں زندگی کی بنیاد اسی حقیقت پر قائم ہے۔ سطحِ ارضی پر ہمارے عارضی قیام کے لئے فطرت کی کارسازیاں ہم ہر لمحہ دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ قدرت کی نظر میں زندگی کی محبوبیت کی قوی دلیل ہے۔ بچے کے بچھڑنے پر ماں کے جگر کی ہوک اور اُس کے قلب پر درد و کرب کی قیامت خیز بجلیاں ماں کی محبت کی شدت کو ظاہر کرتی ہیں۔ مخلوق سے خالقِ کائنات کی محبت اس سے ہزار گنی زیادہ ہے۔ حیاتِ جاوید کی بخشش میں رحمتِ خداوندی کی فیاضی اسی جذبۂ محبت کے لئے صلائے عام ہے کہ رحمۃ للعالمین بن کر ہستیاں اُبھر رہی ہیں اور زندگی کا سامان کرتی جا رہی ہیں۔ قدرت کے خزانے کا سب سے قیمتی جوہر آدم کو عطا ہوا ہے۔ کاش کہ انسان اس آب و گل کی زندگی میں زندگی کے بے پایاں امکانات سے آنکھیں بند کر کے اسرارِ حیات کو

فراموش نہ کر دیتا۔ یہ تو اس کا پہلا سبق تھا جس نے روزِ ازل فرشتوں کو شرمندہ کر دیا۔ انسان کی یہی خود فراموشی اسے زندگی سے بیگانہ بنا رہی ہے۔

...ستر۔ اچھا تو تم یہ بتاؤ کہ زندگی کے ان امکانات کو کس نے دیکھا ہے اور روزِ ازل کی کارروائیوں کا کون تماشائی ہوا ہے؟ یہ ضرور ہے کہ زندگی کا سلسلہ موت کے ساتھ برابر لگا ہوا ہے لیکن یہ سلسلہ بھی بڑا دردناک ہے۔ زندگی کی تخلیق پھر موت کا سامان کر رہی ہے۔

عابدہ۔ دراصل موت کا زندگی کی گھات میں لگا رہنا اور زندگی کا نت نئی شان میں ابھرتے رہنا کاروانِ وجود کے ذوقِ تجدد کو تیز تر کرتا جا رہا ہے اور زندگی کا قدم منزل بہ منزل آگے کی گزرگاہ کی تلاش میں ہے۔

...جستو۔ لیکن یہ کاروان آخر عدم ہی کی منزل کا راہی ہے۔

عابدہ۔ (اس کی پیشانی پر ہلکے ہلکے خطوط ابھر کر غائب ہو جاتے ہیں) عالمِ وجود کا معدوم ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا اگرچہ وہ وجود ہماری نظروں سے اوجھل ہی کیوں نہ ہو جائے۔ سرشتے کو قدرت نے ذوقِ حیات عطا کر کے حفظ خودی کا ایک ایسا جذبہ مرحمت کیا ہے جو قدرت کی نظر میں زندگی کی محبوبیت کا یقین ثبوت ہے۔ اس زندگی کی حفاظت کے لئے خدائی

قوتوں نے بڑا اہتمام کیا ہے۔ مادّی وجود کے لئے حواس کی تخلیق خطرات سے تحفظ کا کیسا مضبوط دفاعی حلقہ ہے۔

اختر۔ (عابدہ کے چہرے کو غور سے دیکھ کر تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) لیکن اے محترمہ کیا تم نہیں دیکھتیں کہ اس مٹی سے بنے ہوئے آدم کی موت کے سامان ہر ٹھوکر کے ساتھ ہیں اور ٹھوکریں ہر قدم کے ساتھ۔ اس دل سے کسے معلوم کب زندگی کی حرکت چھین لی جائے۔

عابدہ۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا زندگی کی اس حالت کو آدم کے خاتمے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ قدرت کی کارسازی نے حفظ خودی کے بڑے مضبوط سامان کر دئیے ہیں۔ زندگی کی بقا کے لئے قدرت کا عام دسترخوان زمین کے چپے چپے پر پھیلا ہوا ہے۔

اختر۔ (کچھ بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے) تم نے زندگی کو ایک موہوم طلسمی شئے سمجھ رکھا ہے۔ تمہاری نظریں "ستاروں سے آگے کئی جہان اور بھی ہیں"۔ تم نے زندگی کے مصائب پر فقط مسکرانا سیکھا ہے جو ایک از خود رفتہ شخص ہی کر سکتا ہے۔ کیا اس زندگی کو کسی اور قیامت کا انتظار ہے؟

عابدہ۔ زندگی خود ایک قیامت ہے۔ اس کے شور نشور سے فضاؤں کو گونجنا چاہیئے۔

اختر۔ تو گویا اسی دن کے لئے خالق کی کارسازی نے مخلوق کے رگ و پے میں جان دوڑائی ہے۔ انسان کا وجود اپنے ساتھ آتش فشانی ہنگاموں کو لیکر ابھر رہا ہے۔ پھر یہ زندگی موت کے ڈراؤنے بھوت کو حورِ بہشتی کی شکل کیونکر بخش سکتی ہے؟

عابدہ۔ کیوں نہیں؟ البتہ اس کے لئے پیکارِ حیات سے مسلسل ہم آغوشی اور شدائد میں نفس کی مجنونانہ جد و جہد درکار ہے۔

اختر۔ لیکن تم نے اس پیکارِ حیات کی روح فرسا کیفیت کا اندازہ بھی کیا ہے؟ (کچھ سکوت کے بعد آنکھیں بند کر کے کھول دیتا ہے اور ایک لمبی سانس لیتا ہے) زندگی کا قاتل، خنجر بکف درندہ کسی بے بس مظلوم اور مجبور کے سینے پر سوار اس کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے مستعد ہے۔ کیا تم نے اس بدنصیب کے قیامت خیز اضطراب کی ساعتیں اپنے دل پر گذار کر بھی دیکھی ہیں جس کا گلا چمکتے ہوئے خنجر کے تلے لرز رہا ہے؟ زندگی کی یہ خون آشام کیفیت الفاظ کے جامے کو جہنم کی آگ سے سلگا رہی ہے۔ قوتِ اظہار اس کے خیال سے کانپ اٹھتی ہے۔ یا اللہ! یہ قیامت بدوش ساعتیں کتنی زندگیوں کے نصیب میں آئی ہیں۔ زندگی کا مآل زندگی کو دیکھ کر دم بخود ہے۔

عابدہ۔ (اس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر اندرونی پیچ و تاب نمودار ہوتا ہے) زندگی کو اسی مآل کے لئے

بلطیب خاطر تیار ہو جانا چاہیئے اور یہی زندگی کے استحکام کی دلیل ہے۔ بلاشبہ وہ دل جو زندگی کی اس کڑی منزل میں اپنے حواس کی خاطر جمعی میں ناکام رہا زندگی کے اس انجام کے خیال ہی سے پریشان ہو جانا اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ یہ سانحہ کتنی قیامتوں کا سامان لیکر نمودار ہوتا ہے اس غریب کے دل کی اس کیفیت سے زندگی مجبور ہو کر ایک ماتم کدہ بن کر رہ گئی۔ موت کا یہ شکار زندگی کو کوستا ہوا موت سے ہمکنار ہے۔ موت کی یہ ہیبت کتنے جنونوں کا سامان کر رہی ہے! حرف و صوت کی ترجمانی اس درد و کرب کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ اس مسکین کا سارا وجود زلزلوں سے گھرا ہوا اس پہ غشی کے دورے طاری کر رہا ہے۔ یا اللہ! زندگی کا یہ سانحہ خود زندگی پر ماتم کر رہا ہے کہ بحر و بر کا سلطان موت کی بارگاہ میں سر بسجود ہے اور موت کا خوف اسے کھائے جا رہا ہے۔

زندگی ارکان اربعہ کی پریشانی سے لرز اٹھنے کا نام نہیں ہے۔ حقیقت میں زندگی نام ہے موت کے ڈراونے خواب کو ایک جانفزا آئینہ میں تبدیل کرنے کا۔ ہم نے حسینی معرکے کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ اس لئے ہماری زندگی کو رونا نصیب ہو گیا۔

مختصر۔ یہ جنون صرف غیبی قوتوں پر ایمان رکھنے والا ہی پیدا کر سکتا ہے کہ جس نے موت کے بعد اپنے لئے ایک خیالی جنت بھی

تعبیر کر لی ہے۔ زندگی کی حقیقت عناصر اربعہ کی ترکیب سے ظہور میں آنے والے وجود کے سوا اور کچھ نہیں اور انہی اجزائے ترکیبی کا انتشار موت ہے۔ اس کے بعد بھیانک تاریکی۔

عابدہ۔ اگر زندگی کی حقیقت یہی ہے تو حیاتِ انسانی زندگی کا مہیب ترین سانحہ ہے کہ بے پایاں صلاحیتوں والا انسان آخر معدوم ہے۔

اختر۔ یقیناً زندگی خود ایک ایسا سانحہ ہے جس کی ہولناکی کو دور کرنے کے لئے آپ کی خیالی جنت نہایت دلفریب اور اچھے نظریہ ہے۔

عابدہ۔ (ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر دوڑ جاتی ہے) کچھ نہیں تو کم از کم اس نظریے کا یہی افادی پہلو زندگی کے سکون کے لئے بہت ہے۔

اختر۔ لیکن آخر انسان اس فریبِ زندگی میں کب تک مبتلا رہیگا؟

عابدہ۔ جب تک وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔

[کیمپ کے ایک گوشے سے فجر کی نماز کے لئے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔]

مجلس سوم

"منظر اوّل"

(مقام نیا، ماحول نیا، زندگی نئی، اور زندگی کے کاروبار بھی نئے۔ اب یہ اختر شہر کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس مکان کے ایک کمرے میں دری کا فرش ہے۔ وسط میں ایک تپائی ہے، جس کے چاروں طرف کرسیاں ہیں۔ کونے میں ایک الماری ہے۔ الماری کے پاس دیوار سے لگی ہوئی چھوٹی میز پر ریڈیو سیٹ رکھا ہوا ہے۔ اسی دیوار پر ایک گھڑی لگی ہوئی ہے۔ اختر کرسی پر بیٹھا ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے ناہید اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھی ریڈیو سیٹ کی زبانی درس قرآن مجید سن رہی ہے)

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔

اور یاد رکھو کہ البتہ ہم تمہیں آزمائیں گے، کچھ خطرات کے خوف سے کچھ بھوک کی تکلیف سے کچھ جان و مال کے نقصان سے اور کچھ پیداوار کی تباہی سے۔ یہ وہ آزمائشیں ہیں جو تمہیں پیش آئیں گی۔ پھر وہ لوگ

جو صبر کرنے والے ہیں انھیں فتح و نصرت کی بشارت دے دو

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پڑتی ہے تو وہ پریشان نہیں ہو جاتے بلکہ یہی کہتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ یہ ہماری زندگی اور موت، رنج و راحت، سود و زیاں جو کچھ بھی ہے اللہ کے لئے ہے، ہمیں بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

جن لوگوں نے ان مصائب کے جواب میں صبر کا ثبوت دیا اور نہ صرف کفرانِ نعمت کی بدبختی سے خود کو بچا لیا بلکہ ان مصیبتوں کو وسیلۂ ذکر و شکر بنا لیا وہی لوگ اس خوشخبری کے مستحق ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔

سو یقیناً یہ وہ نفوس ہیں جو اپنے پروردگار کے لطف و کرم کے حقدار ہو جاتے ہیں اور ان کے رب کی رحمت ان کے شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ یہی لوگ راہِ ہدایت پر گامزن ہیں۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے :-

پیروانِ دعوتِ قرآنی کو ایمان کے رشتے میں منسلک کر کے سرگرمِ عمل ہونے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اطاعت کی راہ میں وہ صعوبتیں بھی پیش آئیں گی جو صبر و قرار، سکون، اطمینان اور جرأت و استقامت سب ہی کو دعوتِ پیکار دیں گی۔ یہ وہ آزمائشیں

ہیں جن سے ایک مردِ مومن کو گذرنا ناگزیر ہے، اس لیے صبر و استقامت کی تلقین کر کے جان فروشی اور قربانی کی دعوت دی گئی ہے اور ساتھ ہی وہ اصول اور مہمات بھی بیان کر دیئے ہیں جن میں ثابت قدم رہنا ایمان کا تقاضا اور مطالبہ ہے تاکہ انسانیت کا دامن گمراہیوں کی آلودگیوں سے داغدار نہ ہو جائے۔

'صبر کی حقیقت یہ ہے کہ انسان نفس کی خواہشوں پر غلبہ پا کر ایمان اور عقل کی روشنی میں زندگی کی مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرے ساتھ ہی نماز کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے روح کے لئے تقویت کا سامان بھی کرتا جائے۔

'مصائب کے طوفان میں زندگی کی ساری پریشانی موت کی ہیبت ہے اسی خوف کو دور کرنے کے لئے موت اور زندگی کی حقیقت کو بھی آشکارا فرمادیا ہے تاکہ زندگی کے بجائے موت کی محبوبیت دلوں میں بس جائے، راہ حق میں 'موت نہیں، سرتاپا زندگی اور ہدایت ہے جذبہ سرفروشی کو دعوت یہی ہے کہ۔

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

'ابھی مولانا عبدالعزیز صاحب نے سورہ بقرہ کے انیسویں رکوع کی آیات کی تفسیر بیان فرمائی۔ اب نور جہاں بیگم اپنا پیارا گیت .....

(عابدہ ہاتھ بڑھا کر ریڈیو سٹ بند کر دیتی ہے)

اختر۔ (عابدہ کی طرف دیکھ کر) موت کی تلخیوں سے گذر کر تم نے زندہ رہنا بھی تو نہیں سیکھا۔ زندگی......

عابدہ (بات کاٹ کر) یہ زندگی اپنی بقا کے لئے فقط نغمۂ داؤدی کی محتاج ہے جوان سینوں کی امانت ہے جنہوں نے اپنے اندر جبرئیل کے نفس کو بیدار کیا ہے۔

اختر۔ جبرئیل کا نفس اور نغمۂ داؤدی سسکتی ہوئی دنیا کے نالہ و شیون سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ یہ صبر و شکر کی تلقین اور اطاعت و ضبط نفس کی ترغیب طفلانہ آہنگ تبلیغ کے سوا اور کیا ہے۔

عابدہ۔ سسکتی ہوئی دنیا آج اسی مسیحائی کو ترس رہی ہے۔

اختر۔ (تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) جی ہاں جب انسان مصیبتوں میں گھر جاتا ہے اور آفتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹنے لگتے ہیں تو اس تلقین کی بے بضاعتی خود بخود کھل جاتی ہے۔

عابدہ۔ یہ صحیح ہے کہ مضطرب الحال انسان وقتی طور پر بے بسی کے خیال سے پامال ہو جاتا ہے لیکن بالآخر ایمان کا سہارا اسے بے پایاں قوت کا مالک بنا دیتا ہے۔

اختر۔ اس کشمکش میں ایمان کے سہارے بھی ایک ایک کر کے سب ٹوٹ جاتے ہیں۔

عابدہ۔ اصل میں ایمان کی قوتیں بے سروسامانی ہی میں ابھرتی ہیں

ہوتی ہیں جب اسباب کا طلسم باقی نہیں رہتا۔

اختر ۔ جب انسان کے ہوش اڑ جاتے ہیں تو یہ قوتیں بھی حیران و پریشان ہو جاتی ہیں۔ انسان کی خیالی تسلی حقیقت حال کو نہیں بدل سکتی۔

عابدہ ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی ایک تدبیر نے زندگی کے معرکے میں سرخروئی عطا کی ہے۔ جو مصیبت انسان پر نازل ہوتی ہے زندگی سے فرار کا سبق دیتی ہے۔ یہی ایمانی قوت آہنی عزائم بخش کر ہر معرکے میں ثابت قدم رکھتی ہے۔ حوصلہ مند انسان بے قرار ہو سکتا ہے، بے صبر نہیں۔

اختر ۔ جی نہیں، آپ ایمان کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ حوصلہ شکن مصیبتیں انسان سے صبر و قرار سب ہی چھین لیتی ہیں۔ آفتوں کے طوفان جذبۂ اطاعت اور ضبط نفس کو بہا لیجاتے ہیں۔ درحقیقت انسان کی حرماں نصیبی باوجود اپنے نیاز مندانہ جذبے کے چیخ اٹھتی ہے کہ

میری قسمت میں غم جو اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

عابدہ (اس کے چہرے پر داخلی کشمکش کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ غم و اندوہ کے تازہ زخموں کو وہ اپنے معتقدات کے مرہم سے مندمل کرنا چاہتی ہے۔)

یہ سچ ہے کہ انسان کی زندگی حوصلہ شکن موانع سے گھری ہوئی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی معرکۂ وجود انسان کی

زندگی کا ضامن بھی ہے۔ پیکارِ حیات میں زندگی کے شرارے اسی تصادم سے پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی کے زیر و بم میں خالق کائنات کی مصلحت بھی یہی ہے۔ اس جہاد اکبر میں جو ضربیں اس پر پڑتی ہیں، اس کے جواب میں صبر و ضبط کی قوتیں زندگی کو سخت اور مضبوط بنا دیتی ہیں جو بالآخر موانع کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔ اپنی توانائیوں پر ایمان اور آہنی عزائم کی بیش بہا نعمت اسی کے دم قدم سے ہے۔ اطاعت کی راہ میں مشکلات کا مقابلہ ہی انسان کے عہدۂ جلیلہ کے شایان شان ہے۔

اختر۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ جب معرکے کا وقت آتا ہے اور تصادم کی چنگاریاں بھڑک کر شعلے برسانے لگتی ہیں تو اس نظریے کی حقیقت خود بخود کھل جاتی ہے۔ زندگی کے تصادم اور زلزلوں میں لفظی بلند آہنگ عزائم سے ایمان کی مضبوطی ثابت نہیں ہوتی۔ ان نفوس کے لئے آیاتِ صبر و شکر کی اشاعت و تلقین درد کا درماں نہیں بن سکتی۔ یہ ایک فریب ہے جس میں انسان صدیوں سے مبتلا ہے۔

عابدہ۔ ہمارا یہ خیال اس بنا پر ہے کہ ہم نے فقط ہر ہاں کمست عناصر کو معرکہ آزما ہوتے دیکھا ہے۔ ہماری نظروں نے اعلیٰ نفوس کو فروغ پاتے نہیں دیکھا، اور جو زندگیاں

ہمارے لئے اسوۂ حسنہ بن سکتی ہیں انہیں ہم صفحۂ خیال سے محو کر دینا چاہتے ہیں۔

(باہر سے آواز آتی ہے) "پوسٹ مین"

[اختر کرسی سے اٹھ کر باہر جاتا ہے اور لفافہ چاک کرتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ وہ خط کھولتا ہے]

اختر۔ (خط پر نظر ڈال کر عابدہ کی طرف دیکھتا ہے) میاں محمود کا خط ہے۔

(عابدہ استعجاب اور اضطراب سے اختر کی طرف دیکھتی ہے)

عابدہ۔ ذرا بلند آواز سے پڑھیئے۔

اختر۔ (خط پڑھنے لگتا ہے) اختر صاحب! السلام علیکم۔
بھائی الطاف کا مرسلہ خط گھومتا گھامتا مجھ تک پہنچا اس لئے کہ میں نے اپنا سابقہ مکان تبدیل کر دیا ہے۔ آپ کے حالات اور پتہ معلوم ہوا۔ خط پڑھ کر جتنی مسرت ہوئی اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ ساتھ ہی عریضہ لکھتے ہوئے رنج و غم کے جو پہاڑ قلب پر ٹوٹ رہے ہیں اس کی کیفیت کا اظہار بھی حرف و صوت کے بس میں نہیں ہے۔ بھائی الطاف نے آپ کے حوالے سے بہت سی اطلاعات طلب فرمائی ہیں میرا دل و دماغ کام نہیں کرتا کہ جواب میں کیا لکھوں ان کے استفسار کا جواب...
... "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" کے سوا کچھ نہیں پاتا۔

(عابدہ ایک سرد آہ بھرتی ہے، اس کے قلب کی ہیجانی کیفیت کے آثار اس کی حرکات و سکنات میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور چہرے پر بجلی کے خطوط بن کر غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ بے اختیار آنسو بہانے لگتی ہے، اختر اٹھتے ہوئے طوفان کو روک نہیں سکتا۔ اس کی داخلی کشمکش اس کے چہرے پر نمایاں ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر تک ایک خاموش ماتمی سماں بندھا رہتا ہے۔ آخر اختر ٹھنڈی سانس لے کر چہرے کو رومال سے صاف کرتا ہے۔ وہ خط کو میز پر رکھ دیتا ہے۔ اور تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ پھر میز سے خط اٹھا لیتا ہے اور رک رک کر پڑھتا ہے)

"میرے اس خط کو پڑھ کر آپ کے دل پر جو غم و اندوہ کی بجلیاں گر رہی ہوں گی اس کے تصور سے میں کانپ رہا ہوں۔ لیکن زندگی کی اس قیامت صغریٰ میں آپ کو یہ بھول جانا چاہیے کہ زندگی کی دوامی اور لازوال حرکت میں یہ عارضی سکون زندگی کے خاتمے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کا شاہکار محض مادی جسم کے وجود میں قید نہیں کیا گیا۔ یہ ہمیں خوب جان لینا چاہیے کہ اس سطح ارضی پر زندگی کی بخشش اور اس کا خاتمہ ایک ہی قادر مطلق کے قبضۂ قدرت میں ہے،

غیر کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں۔ اپنے رب کی طرف روح کی طلبی حیات جاودانی کا عطیہ ہے جو اس دعوت پر لبیک کہنے والی خوش بخت ارواح کا مقسوم ہے۔ زندگی کے اس انقلاب میں ہمارے درد کی دوا صرف "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" ہے۔ دراصل ان شدائد میں قدرت کی جھنجھوڑ ہے کہ صدیوں سے سونے والے نفوس اب بھی جاگ اٹھیں، کاش ہم اس انقلاب کے تیور پہچانتے!

خودی را سوز و سازے دیگرے دہ

جہاں را انقلابے دیگرے دہ

ستارہ صوفیہ سلمہا کے متعلق میں کیا عرض کروں کہ وہ کہاں گئیں! اللہ تعالیٰ عزیزہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ صحیح ہے کہ جب پرانی صحبتیں یاد آتی ہیں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے لیکن جب ہم نے یہ خوب جان لیا کہ کارخانۂ ہستی کو ایک روز برہم ہونا ضرور ہے تو زندگی کا یہ ملال بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر زندگی نے فرصت دی اور اللہ کو منظور ہوا تو حاضری کی کوشش کروں گا۔

اماں سب کو دعا کہتی ہیں۔ والسلام۔

تمہارا بھائی محمود۔

(اختر کرسی پر بیٹھ جاتا اور چہرے کو رومال سے بار بار صاف کرتا ہے عابدہ چلی جاتی ہے)

منظر دوم

(ڈاکٹر عبدالعزیز کے دواخانہ کا کمرہ۔ وسط میں ایک بڑی میز ہے جس پر قلم، دوات، رجسٹر اور کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ میز کے تین طرف کرسیاں پڑی ہیں۔ ایک کرسی پر ڈاکٹر عزیز بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے دیوار سے لگی ہوئی ایک بنچ ہے پشت پر ایک کھڑکی ہے جو سڑک پر کھلتی ہے۔ داہنی طرف دروازہ ہے۔ عزیز بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ یہ ایک دراز قامت قوی ہیکل جوان ہے۔ رنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی جن سے ذہانت کے ساتھ بے مروتی اور بے باکی ٹپکتی ہے۔ اس کے گول چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ ناک نقشہ برا نہیں۔ وہ بار بار سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ اختر داخل ہوتا ہے۔ عزیز اسے دیکھ کر مسکراتا ہے اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

عزیز۔ خوش آمدید!

اختر۔ مزاج شریف!

عزیز۔ (مسکرا کر) بس انتظار کی گھڑیاں گنتا بیٹھا ہوں (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے۔

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

پہلے یہ فرمائیے کہ اہلیہ محترمہ کا کیا حال ہے۔

اختر۔ طبیعت حسب دستور ہے۔

عزیز۔ تو شام کو مریضہ کو دیکھ ہی نہ لوں؟

اختر۔ بس آپ دوا تجویز کر دیجئے۔

عزیز۔ آپ عجیب آدمی ہیں۔

اختر۔ (آواز کو قدرے بلند کر کے) وہ پردہ نشین خاتون ہے۔

عزیز۔ (مسکرا کر) بہت خوب! بھلا ڈاکٹر سے بھی کوئی چھپ سکا ہے؟

اختر۔ اور جو ڈاکٹر کے سوا کسی اور کو شافی مطلق جانے؟

عزیز۔ موت کے سامنے ڈاکٹر یاد آہی جاتا ہے۔

اختر۔ اور جو موت اور زندگی کو اللہ کے اختیار میں دیدے؟

عزیز۔ (سگریٹ کا ڈبا پیش کرتے ہوئے مسکرا کر) اب کیا عرض کروں، ایسا مریض لا علاج ہے۔

اختر۔ (ڈبے سے سگریٹ نکال کر جلاتا ہے۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے) ہاں تو کل کی روداد سنائیے اور آج کا پروگرام بنائیے۔

عزیز۔ (مسکراتے ہوئے) وہی حدیث دلربائی؟

اختر۔ اس غمناک زندگی کو تڑپنے کی فرصت ہی کیوں ملے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

عزیز۔ بہت خوب، آپ میرے انتخاب کی اب بھی داد نہ دیجئےگا؟

ـتر۔ مگر آپ کا گنوار پن جو نہیں گیا۔
ـزیز۔ (ہنستا ہے) قبلہ! میری مشکل یہ تھی کہ محترمہ میں کم آمیزی کا عیب ابھی باقی ہے۔ اور یہ ہر نووارد کا فطری عیب ہے۔
ـتر، یعنی نو آموز کا۔
ـزیز۔ جی نہیں، یہ کہیئے کہ ابھی اس میں قناعت کی خو باقی ہے۔ اس غریب نے اب تک ایک حفیظ صاحب کی صورت دیکھی ہے۔ اس کے تخیل کا میدان نہایت تنگ و تاریک ہے۔ جب اس کا شعور بیدار ہوگا تو اس کے قلبی رشتے بھی پھیلتے جائیں گے۔
ـتر۔ (مسکرا کر) سبحان اللہ! آپ کا تجزیہ قابل داد ہے۔ آپ...
ـزیز۔ اور وہ اپنے لئے بہتر مقامات تلاش کرے گی۔ اور بھائی تم، حق تو یہ ہے کہ اس کی قسمت حفیظ سے بہتر شخص کی حقدار ہے۔ (وہ مسکراتا ہے)
ـتر۔ یہ حقیقت ہے کہ زمانہ اس کے حسن کی کچھ بھی جزا نہ دے سکا
ـزیز۔ حسن؟ اللہ اکبر! محفل کی جان! دلوں کا سرور، جگر کی ٹھنڈک۔ انجمن......
ـتر۔ اس لئے کہ اس کے خوبصورت چہرے پر بے حیائی کا داغ نظر نہیں آتا۔
ـزیز۔ (ہنستا ہے) آپ کا مطلب سمجھنا بھی تو بڑا دشوار ہے۔

اختر۔ اس لئے کہ حسن کا تھوڑا سا مذاق ابھی مجھ میں باقی ہے۔

(وہ مسکراتا ہے)

عزیز۔ (مسکرا کر) یعنی؟

اختر۔ یعنی حیادار چہروں کے جمال کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

عزیز۔ معاف کیجئے آپ کی شاعرانہ لطافت کا میں قائل نہیں ہوں حسین سے زیادہ حسن کی ادائیں دلفریب ہوتی ہیں۔ شرمیلی طبیعتیں ادائیں پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

اختر۔ (مسکرا کر) شکر ہے کہ اس محرومی کا تمھیں خود اعتراف ہے۔ شاعرانہ لطافت انسان کی فطرت صالحہ کی دلیل ہے۔ شرم ایک ادائے ناز ہے جس پر لاکھوں بناؤ قربان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منافق چہروں سے خوبصورتی چھین لی جاتی ہے۔

عزیز۔ (ہنستا ہے) تم کبھی کبھی دقیانوسی اخلاق کی باتیں بھی کرنے لگتے ہو۔ شاید تمہاری رگوں میں ابھی پرانا خون باقی ہے۔

اختر۔ میری مصیبت تو یہ کہ

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

عزیز۔ سبحان اللہ! یعنی ابھی آپ پورے انقلابی نہیں بن سکے۔

اختر۔ (مسکرا کر) سچ پوچھو تو میں کبھی کچھ نہیں بن سکا اور نہ کچھ

بننے کی خواہش ہے۔

عزیز ۔ یہ بھی غلط ہے۔ خواہشیں ہزاروں ہیں۔ غالب کا وہ کیا شعر تھا؟ ہزاروں ۔

اختر ۔ (مسکراتا ہے) ہزاروں خواہشیں ایسی ۔

عزیز ۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اختر ۔ آخر آپ نے شعر پڑھنا سیکھ ہی لیا ۔

عزیز ۔ (مسکراتے ہوئے) یہ آں محترم کی صحبت کی کرامت ہے۔ ابھی تو آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے ۔

اختر ۔ (مسکرا کر) دیکھئے اب آپ مجھ سے سیکھتے ہیں یا میں آپ سے ۔

عزیز ۔ (ہنستا ہے) لیکن بندہ تو حضور کے حلقہ بگوشوں میں نام لکھا چکا ہے ۔

اختر ۔ آپ کو ایسی باتیں کرنی آتی ہیں آپ کیجئے ۔ میں خاموش رہونگا ۔ (دونوں ہنستے ہیں)

عزیز ۔ (کرسی سے اٹھتا ہے) اچھا تو اب تشریف لے چلئے ۔ حدیثِ دلبری کے لئے عمر درازہ باقی ہے اور بینک کے بند ہونے میں صرف پندرہ منٹ ۔

اختر ۔ (کرسی سے اٹھتے ہوئے مسکرا کر) بہت خوب !

عزیز ۔ تو ساری رستم آج ہی عطا کیجئیگا ۔
اختر ۔ ورنہ آپ یہ موٹر جو چھین لیں گے ۔
(دونوں ہنستے ہیں)

منظر سوم

[اختر کا نیا پر تکلف مکان۔ ایک بڑی عالیشان عمارت باغ کے درختوں سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے دونوں پہلوؤں پر متوازی سڑکیں ہیں جو باغ کے دو پھاٹکوں سے گزر کر شاہراہ سے مل جاتی ہیں۔ ان سڑکوں کے درمیان اور مکان کے سامنے کے صحن میں ایک گھاس کا تختہ ہے جس کے بیچ میں ایک حوض اور حوض کے وسط میں فوارہ ہے۔ رنگ برنگ کے پھولوں کے پودے گملوں میں چاروں طرف نظر آتے ہیں۔ مکان کے برآمدے کے ستونوں سے خوشنما بیلیں لپٹی ہوئی ہیں۔

برآمدے کے وسط میں ڈرائنگ روم کے مقابل ایک خوبصورت چھوٹی گول میز کے گرد چند کرسیاں بچھی ہیں۔ ڈرائنگ روم نہایت کشادہ ہے۔ اس میں دری اور قالین کا فرش کیا گیا ہے اور وہ دیدہ زیب فرنیچر سے آراستہ ہے۔ اس کا ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں برآمدے کی طرف کھلتی ہیں۔ اندر تین دروازے تین کمروں کی طرف ہیں۔ دروازے اور کھڑکیوں میں قیمتی رنگین پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر بہت سی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ عابدہ اور اختر پاس پاس دو صوفوں پر بیٹھے ہیں۔ اختر کے چہرے پر

برہمی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ عابدہ ملول اور پریشان معلوم ہوتی ہے)

عابدہ۔ (گفتگو کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے) ابا مرحوم کی دولت سے محمود بھائی نے جو حصہ پایا وہ مرحوم کی زندگی کا قصہ ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اختر۔ اسے اپنے ابا مرحوم ہی کی تعلّی ہی کہہ لیجئے لیکن میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ غیر بیٹی سے زیادہ حصہ پائے۔

عابدہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ابا جان نے محمود بھائی کو جو دیا اس کا بڑا حصہ قومی کاموں کے لئے وقف ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ دولت کا مصرف اس سے بہتر اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

اختر۔ (نہایت برہم ہوکر) یہ سب باتیں تو تم جانو۔ میں تو اس قدر سمجھتا ہوں کہ تمھاری ہمدردیاں محمود کے ساتھ ہمیشہ سے رہی ہیں۔

عابدہ۔ (حیرت سے اختر کی طرف دیکھتی ہے) خدا کی پناہ!

اختر۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اس نئے مکان کے خریدنے کے بعد اب ہمارے پاس باقی ہی کیا رہ گیا ہے؟

عابدہ۔ معاف کیجئے گا اگر میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ یہ سب ہماری بے اعتدالی کا نتیجہ ہے۔ انتخابی مہم سر کرنے کے بعد اور کلب کے گوناگوں مشاغل کے ساتھ اس سے زیادہ اور کیا باقی رہ سکتا ہے۔ اور پھر اب بھی جو کچھ ہے

کم نہیں ہے بشرطیکہ ہم آیندہ پھونک پھونک کر قدم رکھیں اور اپنے ماحول کو بدل دیں۔ اس عالیشان کوٹھی کا خریدنا ایسا کیا ضروری تھا۔

اختر ۔ (خفگی کے لہجے میں) تم ضروری اور غیر ضروری کی بحث ہی میں الجھی رہو۔ تم میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟

عابدہ ۔ میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔

اختر ۔ (غصہ ہوکر) تم میری بات خوب سمجھتی ہو۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ تمہاری بھی یہی خواہش ہے کہ یہ جائداد تمہارے محبوب بھائی کے قبضے میں رہے۔

عابدہ ۔ (پریشان ہوکر) یا اللہ! اب میں کیا عرض کروں!

اختر ۔ میں جانتا ہوں کہ تمھیں اپنے شوہر سے زیادہ دولت سے لگاؤ ہے۔

عابدہ ۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے دولت سے دل لگانا کبھی نہیں سیکھا۔ زندگی سے لگاؤ کی بنا پر مجھے صرف زندگی کی تباہی کا قلق ہے۔

اختر ۔ (چیں بہ جبیں ہوکر) تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟ تم اس قلق کو اب بھی دور کرسکتی ہو۔

عابدہ ۔ میں . . . .

اختر تم مجھ پر حکم چلانا چاہتی ہو؟

عابدہ - یا اللہ! میری کیا مجال جو میں آپ پر حکم چلانے کا خیال بھی دل میں لاسکوں۔ ہاں یہ زندگی کی وابستگی کبھی کبھی لب گستاخی پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ آئے دن پری پیکروں کا نذر دل اور عیش و عشرت کی محفلوں کا گرم رکھنا آخر کس دن کے لئے ہے؟ کیا اس عالیشان کوٹھی کے خریدنے کی یہی ایک غرض تھی؟

اختر - اب اس کو کیا کیا جائے کہ تمھاری نظر ہر چیز میں خرافات دیکھ رہی ہے۔

عابدہ - اب کیا عرض کروں، میں نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ زندگی کی ہر چیز خرافات میں شامل ہے۔

اختر - تمھارے نزدیک دنیا کی کونسی چیز حرام نہیں ہے؟ اور اب تو میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ عنقریب یہ زندگی بھی حرام ہو جائیگی۔ تمھارے مذہب میں اندوہ گیری کے لئے اندوہ ربائی کی کوئی تدبیر جائز اور روا نہیں۔

عابدہ - حضور معاف، سرور کی نوعتیں مختلف ہیں اور اندوہ ربائی کے طریقے جدا جدا۔ سرور جو بدنی اور روحی دونوں صلاحیتوں کی تباہی کا پیش خیمہ ہو، سرور نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ کیفیت غم و اندوہ کو بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت اتنی غمناک ہوتے ہوئے بھی انسان

کی یہ کیفیت ہے۔ اگر اس میں مسرت ہی مسرت سمو دی جاتی تو خدا جانے اس زندگی کا کیا حشر ہوتا۔

اختر ۔ (برافروختہ ہوکر) دقیانوسی قدروں کی دلدادہ عورت تہذیب و تمدن سے بے بہرہ ہے۔ وقت کے تقاضے....

عابدہ ۔ (ہاتھ جوڑ کر) خطا کار سہی .... اگر دنیا آداب کے مفہوم سے بے بہرہ ہو گئی ہے تو اس کا کیا علاج؟ جدید تہذیب و تمدن کے تقاضے یہی ہیں تو اس تہذیب کو سلام۔

اختر ۔ مجھے اس کا یقین ہو چلا ہے کہ تم زندگی میں رفاقت نہ کر سکوگی۔ زندگی کی اس طرح نفی کرنے سے خوشگوار نتائج پیدا نہ ہو سکیں گے۔

عابدہ ۔ اے لو! آخر اسے زندگی کی نفی کیوں کہا جائے۔ زندگی کی نفی صرف انسان کی تخریبی روش ہے۔

اختر ۔ (غصے سے بے تاب ہوکر) تم نری جاہل ہو۔ تم نے اپنے اندر عورت کی فطرت کو مسخ کر رکھا ہے۔

عابدہ ۔ یا اللہ یا اللہ! اب میں آپ کی خفگی کے سامنے کیا عرض کر سکتی ہوں۔ ایک بات کہنے میں آگئی میں نے عرض کر دی، یہ جو آپ کو بری لگی ہیں اس کی معافی چاہتی ہوں۔

اختر ۔ جن مصالح کے لئے اپنے پاس عقل نہ ہو انہیں دوسروں پر چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

عابدہ ۔ لیکن دوسروں پر چھوڑنے کا انجام تو آپ بھی دیکھ رہے ہیں

اختر ۔ (آواز کو بلند کر کے) میں تو کوئی انجام نہیں دیکھ رہا ہوں۔
تمہارا انجام البتہ مجھے نظر آ رہا ہے۔

(عابدہ خاموش ہو جاتی ہے)

منظر چہارم

(اختر کے مکان کا ڈرائنگ روم۔ کمرے کی تفصیل حسب سابق ہے۔
اختر اور ڈاکٹر عزیز صوفوں پر بیٹھے گفتگو میں منہمک ہیں)

عزیز ۔ (مسکرا کر) لیکن قبلہ! اس کی دلربائیاں بھی تو اسی انداز سے ہیں۔

اختر ۔ (ہنستا ہے) صحیح ہے۔ لیکن پہلے میں اپنے بینک کے حساب کا جائزہ بھی تو لے لوں!

عزیز ۔ (قہقہہ لگاتا ہے) خوب! کوٹ آف وارڈس کے ریسیور اور لیاقت حسین کے داماد کو بینک کے حساب کا جائزہ لینے کی ضرورت درپیش ہے؟ واللہ بڑے محتاط آدمی ہو۔

اختر ۔ تمہارے اس حسن ظن کا میں ممنون ضرور ہوں لیکن اب تم سے چھپانا ہی کیا ہے۔ لوگوں کو میری دولت کا غلط اندازہ ہے۔

عزیز ۔ (حیرت سے) یہ سب لغو ہے۔ آخر لیاقت حسین کی لاکھوں کی دولت دو چار سال میں تو ختم نہیں ہو گئی؟ آپ کے منشی صاحب تو آپ کو قارون کا درجہ دیتے ہیں۔

اختر ۔ (ہنستا ہے) یہ منشی صاحب کا خیال ہے۔ اور اکثر حضرات کا

یہی خیال ہے۔

عزیز ۔ (حیرت سے) تو بھائی! آخر وہ دولت گئی کہاں ؟

اختر ۔ گئی رہ کہیں نہیں۔

عزیز ۔ (بے چینی سے) آپ ذرا صاف صاف بتائیے کہ آخر قصہ کیا ہے۔

اختر ۔ قصہ یہ ہے کہ لیاقت حسین لاکھوں کے مالک ضرور تھے اور یہی ایک وجہ ان کی بیٹی کے ساتھ میری شادی کی ہوئی۔ لیکن ان کے ایک بیٹا بھی تھا جس کا مجھے علم نہ تھا۔

عزیز ۔ (تعجب سے) ہیں! وہ بیٹا ہے کہاں ؟

اختر ۔ یہی محمود۔

عزیز ۔ ارے بھائی! تم تو اسے بھانجا بتاتے تھے۔

اختر ۔ یہی بھانجا آخر ورانثۃً بیٹا بن بیٹھا۔

عزیز ۔ میں تمہارا مطلب اب بھی نہیں سمجھا۔ یہ کیونکر ممکن ہے ؟

اختر ۔ بات یہ ہے کہ لیاقت حسین کو محمود سے اتنی ہی محبت تھی جتنی باپ کو بیٹے سے ہو سکتی ہے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ محمود کی شادی عابدہ کے ساتھ ہو۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ عابدہ کی والدہ یعنی میری خالہ کو محمود اور اس کی والدہ سے ازلی دشمنی ہو گئی۔

عزیز ۔ جی"

اختر ۔ یہی وجہ تھی کہ میاں بیوی کے تعلقات زندگی بھر نہایت

کشیدہ رہے۔

عزیز ۔ لیکن غالب تو آخر بیوی ہی رہیں ؟

اختر ۔ جی ہاں۔ لیاقت حسین نے بڑا زور لگایا اور آخر جب میری خالہ نے کوئی صورت اپنی کامیابی کی نہ دیکھی تو صاف صاف کہدیا کہ شادی اور غمی دونوں کا سامان ایک ساتھ کرلیں۔ میرا جنازہ بھی اس گھڑی نکلے گا۔ یہاں لیاقت حسین نے ہتھیار ڈال دیئے۔

عزیز ۔ تو گویا میاں محمود اسی غم میں تجرّد کی زندگی گذار رہے ہیں۔

اختر ۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ بوڑھے باپ نے طیش میں اور محبت کے جوش میں اپنی دولت کا بڑا حصہ محمود کے نام منتقل کردیا۔

عزیز ۔ (تعجب سے اختر کی طرف دیکھ کر) یہ کیا کہہ رہے ہو؟ خدا کی قسم تم بڑے بھولے آدمی ہو۔

اختر ۔ آخر اس میں بھولے پن کی کیا بات ہے؟

عزیز ۔ اچھا میری سنو۔ لیاقت حسین کو شاید یہ اندیشہ رہا ہو کہ تم ان کی دولت کو محفوظ نہ رکھ سکوگے۔

اختر ۔ ہو سکتا ہے۔

عزیز ۔ اور جناب محمود نے اپنی دیانت داری کا سکہ بھی ضرور بٹھایا ہوگا۔

اختر ۔ ظاہر ہے۔

عزیز ۔ تو اب صورت حال یہ ہے کہ قبلہ محمود آپ کی اہلیہ محترمہ کی سرپرستی فرما رہے ہیں ۔ یہ ایک قانون داں باپ کی احتیاطی تدبیر ہے ۔ باپ کا بیٹی کو اتنی بڑی دولت سے محروم کرنا سمجھ میں نہیں آتا ۔

اختر ۔ (اس کے چہرے سے بے چینی ظاہر ہوتی ہے) جی ہاں میں اس احتیاطی تدبیر کے امکان کا کب انکار کر رہا ہوں ؟

عزیز ۔ تم اب بھی امکان کی بحث میں الجھے ہوئے ہو ؟

اختر ۔ (آواز کو قدرے بلند کر کے) تو یقین پیدا کر کے کیا کروں گا ؟

عزیز ۔ وہ کرو جو ایک مرد کو کرنا چاہیئے ۔

اختر ۔ تم نے اختر کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے ؟ میں نے اس سلسلے میں جو کیا اس سے زیادہ ممکن نہیں ۔

عزیز ۔ تم نے کچھ بھی نہیں کیا ۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) واللہ تم بڑے نعز آدمی ہو ۔ اگر یہ سب کچھ وصیت کے تحت ہوا تو وصیت کا عمل تو صرف ایک تہائی پر ہوتا ہے ۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر ۔ (اختر سے) سرکار ! منشی صاحب آئے ہیں ۔

عزیز ۔ اس کم بخت کو دفع بھی کرو ۔

اختر ۔ نہیں بھائی ! یہ غریب تین میل پیدل چل کر آیا ہے ۔

عزیز ۔ اچھا تو پھر مجھے اجازت دیجئے ۔

اختر ۔ (نوکر سے) اندر بلالو ۔ (نوکر چلا جاتا ہے)
(عزیز سے) تو خیال ہے نا، آج شام کو آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں گے ۔
عزیز ۔ (مسکرا کر) خالی کھانے سے تو کام نہیں چلے گا ۔
(دونوں ہنستے ہیں ۔ عزیز اپنی جگہ سے اٹھتا ہے)
آداب عرض ہے ۔
(اختر اور عزیز مصافحہ کرتے ہیں)
اختر ۔ (مسکرا کر) تسلیم ۔
(عزیز چلا جاتا ہے)

منظر پنجم

[اختر کے مکان کا وہی ڈرائنگ روم جس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ عابدہ ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جس کے حاشیوں پر وہ پنسل سے کچھ لکھتی جا رہی ہے۔ اختر داخل ہوتا ہے۔ وہ سفید پتلون اور آسمانی رنگ کا بش کوٹ زیب تن کئے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں ہیٹ ہے۔ وہ جیب سے کاغذ نکال کر پڑھتا ہے اور پھر رکھ لیتا ہے۔ عابدہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ خاموش نظروں سے اختر کے چہرے کا جائزہ لیتی ہے۔]

عابدہ - تو واپسی کب ہوگی؟

اختر - (ترش روئی سے) جب بھی ہو، اس وقت کیا بتاؤں؟

(اختر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے، عابدہ بھی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہے)

ارے چھنو۔

(نوکر آواز دیتا ہے) جی حضور۔

اختر - یوسف سے کہو موٹر نکال لائے۔

نوکر - اچھا سرکار ...... یہ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں

اختر - (بلند آواز سے) آیئے تشریف لایئے ڈاکٹر صاحب!

(عابدہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

اختر - (تحکمانہ لہجے میں) بیٹھی رہو۔

(عابدہ خاموشی سے متصل کمرے کا رخ کرتی ہے۔ اختر عتاب آمیز نظروں سے اس کا پیچھا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب

ہو جاتی ہے ۔)

کم بخت !

(ڈاکٹر عزیز داخل ہوتا ہے)

عزیز ۔ (مسکرا کر) آداب عرض ہے۔ فرمایئے مزاج کیسا ہے ؟

اختر ۔ (ہاتھ ملاتے ہوئے) تسلیم (صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہے) تشریف رکھیئے ۔

عزیز ۔ (اختر کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے) اور یہ کمبختی کس کی آئی ہے ؟ کیوں خیر تو ہے ؟

اختر ۔ اس زندگی میں آپ خیر کی پوچھتے ہیں ؟ (دونوں صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں) بس میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی کو تھا ۔

عزیز ۔ (اختر کے چہرے کی طرف دیکھ کر) وہ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں ۔ لیکن یہ بے وقت کی برہمی کیسی ؟

اختر ۔ اب آپ سے کونسی بات چھپی ہوئی ہے ۔

عزیز ۔ بات یہ ہے کہ زندگی کی شیرازہ بندی کی صورت صرف یہ ہے کہ عورت ، عورت بنکر رہے ۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے ۔

اختر ۔ صحیح ہے ۔

عزیز ۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کی معاشی محتاجی فطرۃً لازمی قرار دی گئی ہے ۔

اختر ۔ جی ،

عزیز ۔ انسان اس زندگی میں جو بھی کرتا ہے ایک لگاؤ کی وجہ سے کرتا ہے۔ جس عورت کو اپنے شوہر سے لگاؤ نہ ہو اس کی زندگی پر حیرت ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے سب سے زیادہ آپ پر حیرت ہے۔

اختر ۔ آپ مجھے اس قدر نادان تصور نہ فرمائیں میں نے ...

عزیز ۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

اختر ۔ اگر اس حد تک میرا زور چلتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ابھی ابھی یہاں تشریف فرما تھیں نوکر نے آپ کے آنے کی خبر دی، بغیر کہے سنے دوسرے کمرے کی راہ لی۔ میں کہتا ہی رہا اور آپ چلدیں۔

عزیز ۔ (مسکراتا ہے) جی، میں سن رہا تھا، اور اس تقریب میں آپ نے کمبخت بھی تو کہا۔ پرسوں بیگم نے آپ سے ہی تو شکایت کی تھی۔

اختر ۔ جی ہاں مجھے یاد ہے۔ اس عورت کا مزاج ہی دنیا سے نرالا ہے۔ خدمت گذاری میں وہ بے مثل ہے۔ لیکن اطاعت شعاری میں قابل افسوس۔ اس کے ارادوں کی عمارت کو کوئی ترغیب، تحریص، اور تہدید منہدم نہیں کر سکتی۔ وہ کہتی ہے "میرے اندر عورت کی صحیح فطرت نے جنم لیا ہے

میں مرد کے ہاتھوں مسخ کی ہوئی فطرت کو بدل کر رہوں گی"

عزیز ۔ اللہ اکبر! محترمہ نے ابھی اس چار دیواری سے باہر قدم ہی کب نکالا ہے؟ دنیا کی تاریخ نے ایسی عورت کبھی پیش نہیں کی۔ وہ کون عورت ہے جو بہلائی اور پھسلائی نہ گئی ہو؟

اختر ۔ یہ تمہاری لن ترانی اس بنا پر ہے کہ تمہیں اب تک ہوا کے اشاروں پر اڑنے والی، زمانہ کے ساتھ بدلنے والی مصلحت اندیش، سادہ لوح اور تقلید پسند عورت سے سابقہ پڑا ہے۔

عزیز ۔ میرے تجربے نے ایک نہیں سیکڑوں جلالی صفات والی عورتوں کو پیش کیا ہے۔ آخر یہی ثابت ہوا کہ مرد کے جادو کے سامنے عورت کو مسحور ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے وہ صرف مرد کے اشاروں کی منتظر ہے۔

اختر ۔ لیکن تم نہیں جانتے، یہاں عالم ہی کچھ اور ہے۔ محترمہ مسکراتی بھی تو اپنی طبیعت سے۔ ان کے لئے انہیں غیر کی دعوت بھی قبول نہیں۔ دنیا کی ستائش سے وہ بے پروا ہے اور زمانہ کے بدلتے ہوئے اثرات سے بے حس۔

عزیز ۔ (مسکراتے ہوئے) لیکن آپ تو فرماتے تھے کہ وہ بہت حساس ہیں۔ اور ان کی گفتار سے شاعری ٹپکتی ہے۔ پھر یہ بے حسی کیا معنی؟

اختر ۔ بھائی عزیز! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے۔ بے حسی کا یہ عالم ہے کہ گویا دنیا میں اس نے کسی سے محبت کرنی سیکھی ہی نہیں اور جس طرح وہ اپنی عادات میں دنیا سے نرالی ہے، اس کا زندگی کا نظریہ بھی جداگانہ ہے۔ وہ اپنے نغموں میں صور اسرافیل کی قائل ہے۔ الہام کے لئے جبرئیل پر کمندیں ڈالتی ہے اس کی فکر و نظر غیبی قوتوں کے حوالے ہے۔ یہی اس کی جان اور یہی ایمان ہے۔ حسن ازل سے عشق کا دعویٰ بھی ہے، بن دیکھے جمال عالم افروز کی شیدائی ہے۔ اسی ایک بارگاہ کی جبیں سائی زندگی کا حاصل ہے، اس کی نظر میں کمال کی بخشش کا بس یہی ایک مقام ہے۔ سرتاپا جمال کا کرشمہ ہے، لیکن نگاہوں سے جلال ہی جلال ٹپکتا ہے۔ جہاں گفتگو میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں، وہاں شعلے بھی برستے ہیں۔ (ڈاکٹر عزیز تعجب سے اختر کی طرف دیکھتا ہے) اصل میں اس کی تعلیم و تربیت بہت برے طریقے پر ہوئی ہے۔ دقیانوسی باپ کی شفقت نے اس کی بے پایاں صلاحیتوں کو رہبانیت کے راستوں پر ڈال دیا۔

عزیز ۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) تو آپ پھر شاعری فرمانے لگے واللہ تم مرعوب الانسان معلوم ہوتے ہو۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر ۔ (اختر سے) منشی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔

اختر ۔ (عبدالعزیز کی طرف دیکھ کر تأمل کے بعد) اچھا اندر بھیج دو۔

(لوٹ کر چلا جاتا ہے)

عزیز ۔ جب دیکھئے بس سر پر سوار ہیں، پریشان ساری دنیا ہے ایک منشی صاحب ہی نہیں۔ خیر تو یہ خوشخبری سنانا بھول گیا کہ آپ کے لئے رقم کا انتظام ہو چکا ہے۔

اختر ۔ شکریہ، لیکن شرح سود بھی طے کر لی ہے؟

عزیز ۔ سب کچھ طے ہو چکا ہے، کل رقم آپ کو مل جائے گی۔

(منشی منیر، الطاف اور محمود داخل ہوتے ہیں؛ محمود کے چہرے پر تفکرات کے بادل گھرے ہوئے ہیں، لیکن اس کی چمکدار آنکھیں اس ظاہری خستہ حالی پر مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اس لئے کہ اس کے عزائم مسلسل تصادم سے سخت ترین ہو گئے ہیں۔ اس کے سابقہ حال میں ایک غیر معمولی تغیر پایا جاتا ہے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھی مسکراہٹ نہیں معلوم ہوتی، اور چہرے سے اندرونی مسرت اور خوش دلی کا اظہار ہونے نہیں پاتا۔ وہ خاموش نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ اختر کی نظر محمود پر پڑتی ہے۔ وہ قدرے تأمل کے بعد مصافحے کے لئے آگے بڑھتا ہے)

محمود ۔ (اختر کی طرف بڑھتے ہوئے مسکراتا ہے) السلام علیکم۔ مزاج مبارک!

اختر ۔ (محمود سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے) اہا! آپ ہیں محمود صاحب۔ وعلیکم السلام۔ فرمائیے مزاج شریف

محمود ۔ الحمد للہ۔

اختر۔ (مسکراتے ہوئے) واللہ میری آنکھوں نے باور نہ کیا کہ وہ
آپ ہی کو دیکھ رہی ہیں۔ میرا تامل قابل درگذر ہے۔
محمود۔ (مسکراکر) بجا۔ لیکن آپ کا بغلگیر نہ ہونا قابل درگذر
نہیں۔ (دونوں بغلگیر ہوتے ہیں)
اختر۔ نوکر نے فقط منشی صاحب کی آمد کی خبر دی۔
محمود۔ اس لئے کہ منشی صاحب نے اسمیں کچھ پیش قدمی بھی تو فرمائی
اختر۔ (ڈاکٹر عبدالعزیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمود سے)۔
آپ ہیں میرے نہایت عزیز دوست ڈاکٹر عزیز۔
منشی منیر۔ (مسکراتے ہوئے) تو گویا آپ عزیز ہی عزیز ہیں۔
عزیز۔ (مسکراکر) جی نہیں میں فقط عبدالعزیز ہوں۔
منشی منیر۔ ماشاءاللہ۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ (سب ہنستے ہیں)
عزیز۔ (آگے بڑھکر محمود سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ سے ملکر مجھے
نہایت مسرت ہوئی۔
محمود۔ شکریہ، میں نے آپ کی تعریف بھائی الطاف کی زبانی
سنی تھی۔ اسی لئے ملاقات کا اشتیاق تھا۔
اختر۔ (الطاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عزیز سے) آپ
جناب الطاف صاحب سے مل ہی چکے ہیں۔ اور
منشی صاحب سے تو آپ کی پرانی شناسائی ہے۔
(ڈاکٹر عزیز الطاف سے ہاتھ ملاتا ہے)

عزیز ۔ (منشی منیر سے ہاتھ ملاتے ہوئے) منشی صاحب کو بھلا کون نہیں جانتا (مسکرا کر) خوب پہچانتا ہوں۔

منشی منیر۔ صحیح ہے۔ "ولی را ولی می شناسد"

عزیز ۔ (مسکرا کر) لیکن منشی صاحب! ولی شیطان کو بھی تو جانتا ہے۔

منشی منیر۔ (چہرے پر مصنوعی حیرت پیدا کر کے ابرؤوں کو جنبش دیتے ہوئے) اللہ اکبر! لیکن ڈاکٹر صاحب یہ کون نہیں جانتا کہ آنجناب عقیدۃً و عملاً ہر طرح ولایت کے منکر ہیں البتہ یہ خاکسار بفضلہ تعالیٰ اس باب میں حق الیقینی کا دعویدار ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

الطاف ۔ (ہنستے ہوئے ڈاکٹر عزیز سے) ڈاکٹر صاحب اب تو منشی صاحب کی کرامت کو تسلیم کرنا ہی پڑیگا۔

(سب صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

عزیز ۔ (خفت کو مٹانے کی کوشش میں ہنس دیتا ہے) بھئی منشی صاحب تو محفل کی جان ہیں۔ یہی کرامت ان کی کیا کم ہے کہ ان کے بغیر دلچسپی کا سامان ہونے نہیں پاتا۔

منشی منیر۔ (جھک کر ہاتھ کو خاص انداز سے جنبش دیتے ہوئے) آداب عرض ہے شکریہ! لیکن یہ دلچسپی آنجناب کی مبارک صحبت کی محتاج ہے

اختر ۔ (محمود سے) کئی دنوں سے آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن ملاقات کے اشتیاق نے صرف انتظار کی زحمت

میں مبتلا رکھا۔

محمود ۔ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اور آپ کے خلوص کا شکر گزار ہوں۔ بات یہ ہے کہ زندگی کو ازسرِنو بسانے کے جھگڑوں ہی سے فرصت نہ مل سکی۔ اب کچھ اطمینان حاصل ہوا تو حاضرِ خدمت ہو گیا۔

اختر ۔ یہ آپ کی نوازش ہے۔ اصل میں زندگی انسان کے ارادے کی پابند بھی تو نہیں رہی۔ انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔

محمود ۔ صحیح ہے، لیکن زندگی کی تگ و دو میں عزائم کو ازسرِنو استقامت بخشنے کی بھی تو ضرورت ہے۔

اختر ۔ انسان کے خواب کی تعبیر جب غلط ہو جاتی ہے تو عزائم کو بھی متزلزل ہونا پڑتا ہے۔ (مسکرا کر) آپ کا وہ اللہ اکبر کبھی جذبہ اب کبھی سنائی نہیں دیتا۔

محمود ۔ (مسکرا کر) آخر میرے جذبے کی آپ کو کیوں فکر آپڑی؟ (اختر مسکراتا ہے) عزائم اپنی استقامت میں صرف انسان کے ارادے کے پابند ہیں۔ خارجی اثرات انہیں متزلزل نہیں کر سکتے اگر ایمان کی ناقابلِ تسخیر قوت سے انہیں مستحکم کیا جائے۔

منشی منیر۔ قطع کلام معاف فرمائیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ آجکل ایمان

ہی عنقا ہے۔ اس سیم وزر کی خدائی میں اللہ کی بندگی کے
لئے کون تیار ہے؟

عزیز ۔ (مسکرا کر) بحمد اللہ، اللہ کی بندگی کے لئے کون کب تیار
رہا ہے؟

الطاف ۔ اب نہ انصار انصار ہے، نہ مہاجر مہاجر۔

منشی منیر ۔ (اختر سے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔

اختر ۔ (مسکرا کر) نیکی اور پوچھ پوچھ۔

منشی منیر ۔ بس اکبر مرحوم کا ایک شعر سن لیجئے۔

(سب منشی منیر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں)

اختر ۔ ارشاد!

منشی منیر ۔ اکبر جو نہ تھا بت خانے میں زحمت بھی ہوئی اور گھر بھی گیا
کچھ نام خدا سے انس بھی تھا کچھ حور بتاں سے ڈر بھی گیا

اختر ۔ واہ منشی صاحب واہ!
عزیز ۔ خوب درمیانی راہ نکالی ہے۔
الطاف ۔ سبحان اللہ۔

منشی منیر ۔ (محمود کی طرف دیکھ کر) اور جناب محمود صاحب، ایک شعر
آپ کو اور سننا ہے۔ (مسکرا کر) میں یہ نہیں کہتا کہ آپ
داد بھی دیں۔

(محمود کی طرف دیکھ کر سب ہنستے ہیں)

محمود ۔ (مسکراتے ہوئے) ارشاد!

منشی منیر ۔ شعر ملاحظہ ہو ۔

کعبے سے جو بت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے، قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا!

اختر ۔ کیا بات کہی ہے ۔

عزیز ۔ بہت خوب ۔

محمود ۔ منشی صاحب ہنسی ہنسی میں کام کی بات بھی کہہ جاتے ہیں ۔

منشی منیر ۔ محمود صاحب! یہ وہ زمانہ ہے کہ آج شہر نار بھی اور مہاجر ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں ۔

اختر ۔ (ہنستے ہوئے) بہت خوب، بہت خوب ۔

محمود ۔ منشی صاحب نے اس میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے ۔

منشی منیر ۔ جی نہیں، محمود صاحب! صورت حال کچھ یونہی ہے، گو پریشان کن ضرور ہے ۔

عزیز ۔ (مسکرا کر منشی منیر سے) لیکن قبلہ! یہ آپ بلا وجہ پریشان بھی کیوں ہیں؟

منشی منیر ۔ بلا وجہ نہیں صاحب! بات ہی کچھ ایسی ہے ۔ ۴۷ء کیا آیا ہماری تو گردنیں کٹ گئیں ۔ معاشی پریشانی، معاشرتی بدحالی، اخلاقی بحران، ایک کو بناتے ہیں تو دس بگڑتے ہیں ۔ ایک کو پکڑتے ہیں تو دس ہاتھ سے نکلتے ہیں ۔ جب زمانہ ہی بگاڑ پر

آجائے تو ہم آپ کیا سدھار سکتے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ اپنی جگہ اُڑی جارہی ہیں۔ بھلا لڑکوں لڑکیوں کا ایک ساتھ ملے جلے تعلیم پانا کس اسلام اور اخلاق نے جائز قرار دیا ہے؟ ایک نیا اسلام پیدا ہو رہا ہے صاحب! ضرورت ہے کہ اس طوفان کو قوت پکڑنے سے پہلے دبا دیا جائے دراصل...

اختر۔ دبا دیجئے اگر آپ دبا سکیں۔

عزیز۔ (تیز ہو کر) حق تو یہ ہے کہ اس نئے زمانے میں آپ کا دقیانوسی وجود ہی نامعقول ہے۔ آخر آپ پریشان ہیں کیوں؟ اس لئے کہ زمانہ پریشانی کے اسباب دور کرنے کے لئے قدم بڑھا رہا ہے؟

منشی منیر۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی شان میں ایسی نامعقول گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتا، البتہ اتنا معروضہ ضرور ہے کہ زمانہ پریشانی کے اسباب دور کرنے کے لئے وہی طریقے اختیار کرتا جا رہا ہے جو آں محترم نے اختیار فرما رکھے ہیں۔

(سب ہنستے ہیں)

عزیز۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

منشی منیر۔ (مسکرا کر) بھلا آپ میرا مطلب کیوں سمجھنے لگے! افلاس، غربت، رشوت، وکیل، ڈاکٹر یہ سب موجودہ دور کی برکات ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مفلوک الحال مریض کو مرتے دم تک

سو دو سو انجکشن سے کم نہ لگنے چاہئیں، میری جوان بچی اسی مصیبت کا شکار ہوئی اور اسے سپرد خاک کرنے کے بعد اب تک ڈاکٹر سے منہ چھپاتا پھرتا ہوں اور وہ قضا کا ہرکارہ برابر بل پر بل بھیجے جاتا ہے۔

اختر (عبد العزیز کی طرف دیکھ کر) ڈاکٹر صاحب! بات منشی صاحب کی صحیح ہے۔ یہ ....

عزیز۔ مجھے منشی صاحب سے کامل ہمدردی ہے۔ ساتھ ہی مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ میرے نظریے سے کہاں تک متفق ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ناکارہ نفوس کو زندہ رہنے کا حق ہی حاصل نہیں۔ یہ رینگتی ہوئی زندگیاں کس کام آئیں گی؟

منشی منیر۔ (ڈاکٹر عزیز کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے) ماشاء اللہ، معاف فرمائیں، میں آپ کی اس ہمدردی کا ممنون نہیں ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ آپ اسی لئے موت کے فرشتے کی نمائندگی فرما رہے ہیں۔ (سب ہنستے ہیں) واللہ، ڈاکٹر صاحب! آپ نے اس طرح کتنی زندگیوں کا علاج کر دیا؟

(ڈاکٹر عزیز کی طرف دیکھ کر سب قہقہہ لگاتے ہیں)

عزیز۔ (خفت کو مٹانے کی کوشش میں منشی منیر سے) مجھے افسوس تو یہ ہے کہ میں آپ کا علاج نہ کر سکا۔

منشی منیر۔ (مسکرا کر) بخشئے حضور، خدا کے فضل سے اس کی نوبت بھی

نہ آنے پائے گی۔ (اختر کی طرف دیکھ کر) آپ تو بس اختر صاحب کا علاج کیجئے، ایسے مریض کم ہاتھ آتے ہیں۔

(ڈاکٹر عزیز کے چہرے سے کچھ پریشانی ظاہر ہوتی ہے محمود اور الطاف مسکراتے ہیں)

اختر۔ (بات کا رخ بدلتے ہوئے) منشی صاحب ایک ڈاکٹر صاحب ہی کو کیوں بدنام کیجئے۔ یہ تو دنیا کے مصائب کی داستان ہے۔

محمود۔ حقیقت میں دنیا کی مصیبت نہ تو ڈاکٹر ہے اور نہ وکیل زندگی کے ہر شعبے کو ایمان اور دیانت کی ضرورت ہے۔

منشی منیر۔ اسی کا تو رونا رو رہا ہوں کہ اگر فرزندان اسلام کو دین فطرت نے ایک روح بخشی ہے تو اس اجتماعیت کی فریب خوردہ جماعت کو اپنا درد محسوس کیوں نہیں ہوتا؟

اختر۔ (مسکرا کر محمود کی طرف دیکھتا ہے) اس کا جواب تو آپ کو محمود صاحب دے سکیں گے۔ میں نہ تو حکومت الٰہیہ کا علمبردار ہوں اور نہ اسلام کی فرزندی کا دعویدار۔

عزیز۔ (محمود کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ان کی خاموشی خود سراپا جواب ہے۔ ان کا جواب کسی کے بس میں نہیں ہے۔

محمود۔ ڈاکٹر صاحب معاف کیجئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مغالطے میں مبتلا ہیں۔ (مسکرا کر) یہ بیٹھے بیٹھے آپ قنوطی ذہنیت کا الزام کیوں دینے لگ گئے؟

عزیز (تیز ہو کر) اس لئے کہ زمانہ آپ کی امیدوں کو پامال کر کے دم لیگا۔
محمود - یہ نہ کہیئے۔ یہ فقط آپ کی تمنا ہے۔ ہاں یہ ایک کشمکش کا دور ضرور ہے اور زندگی کی صحیح تعمیر کشمکش ہی سے شروع ہوتی ہے۔
عزیز - لیکن اس کشمکش کا نتیجہ آپ اپنی توقع سے مختلف پائیں گے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے تیور اور زندگی کے تقاضے کیا آپ نہیں دیکھتے؟
محمود - جی ہاں، بندہ پرور! اللہ کا بڑا کرم ہے کہ میں اندھا نہیں ہوں اسی لئے تو میرا ایقان ہے کہ اب زندگی کی ہر حرکت اللہ کے لئے ہو جانی چاہیئے۔
الطاف - اور خدانخواستہ ہم نے کفران نعمت سے کام لیا تو یہ بھی یاد رہے کہ قدرت کا انتقام اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔
منشی منیر - یہ حقیقت ہے کہ زندگی کا چین اسی میں ہے کہ خالق و مخلوق کا صحیح رشتہ قائم ہو جائے۔
عزیز - مولوی اپنے چین کو لئے مر رہا ہے اور دنیا اپنے درد کا درمان چاہتی ہے۔
منشی منیر - (مسکرا کر) معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب۔ اولاً میں مولوی نہیں ہوں گو تھوڑی بہت ڈاڑھی بڑھانے کا گنہگار ضرور ہوں

(سب مسکراتے ہیں) دوم یہ کہ آپ کی تنگ مزاجی سے تو کبھی
زندگی کو چین نصیب نہ ہو سکیگا ـــــ (سب ہنستے ہیں)
(محمود سے) یہ جو آپ اللہ کے لئے حرکت، کے قائل ہو کر سارے
نظامِ حیات کو اس کی بندگی میں منسلک کر دینا چاہتے ہیں
تو میں اس کے جواب میں صرف یہ عرض کروں گا کہ یہ آپ کا
مذہبی جنون ہے۔

منشی منیر۔ حقیقت میں . . . . .

...تر۔ (بات کاٹ کر) میں اس کا جواب محمود صاحب سے چاہتا ہوں۔

...مود ۔ (مسکرا کر) آپ کی اس عنایت کا میں ممنون ہوں۔
لیکن آپ اس جنون پر مجھ سے بارہا معرکہ آزما ہو چکے
ہیں۔ اب عقل کی باتیں کیجئے۔ بات صرف اتنی ہے کہ
انسان کی زندگی خلوص کی محتاج ہے۔

...تر۔ (مسکراتے ہوئے طنز آمیز لہجے میں) اور یہ خلوص صرف ایمان
بالغیب سے حاصل ہو جائیگا؟

...مود ۔ (مسکراتے ہوئے) آپ میری بات تو سنئے۔

...تر ۔ اچھا فرمایئے۔

محمود ۔ ایک دور فرد کی حکمرانی کا تھا۔ انفرادی حکومت، انفرادی
ملکیت، انفرادی برتری۔ افتخار، اقتدار سب کچھ فرد
کے لئے تھا۔ اس میں کچھ پھیلاؤ پیدا ہوا تو یہی صورت، رنگ،

نسل اور قومیت کی شکل میں جلوہ گر ہوئی جس کا نام جمہوریت قرار پایا۔ یہ نام نہاد جمہوریت قومیت کے نشے سے سرشار ہو کر دنیا کی دیگر اقوام اور جمہور کا خون ایک عرصہ تک چوستی رہی۔ اب دنیا کی نظر نے اس سے زیادہ وسعت کا تقاضا کیا تو چاروں طرف بین الاقوامیت کا راگ الاپا جانے لگا۔ آج کل زندگی کی نئی قدروں نے دستورِ حیات کا بڑا کمال اسے قرار دیا ہے کہ مادی اقتدار سے فرد کو زیادہ سے زیادہ بے دخل کر کے زندگی کو اجتماعیت اور اشتراکیت کا رنگ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریئے کا حال ماضی سے بہتر ہے۔ لیکن . . . .

اختر۔ یہ آپ سو فیصدی اشتراکی کب بن گئے؟

(سب مسکراتے ہیں)

محمود۔ ابھی آپ صرف سننے کی زحمت فرمائیں۔

(اختر ہنستا ہے)

"لیکن اس نظریے کی یہ ظاہری وسعت اور اخلاق کی بلندی طبقاتی عالمی جنگ کو روکنے میں عملاً ناچار رہی ہے۔ وہی انسانی فطرت مختلف زمانوں میں فقط بھیس بدل کر نئے روپ میں جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ تعصب ہمیشہ انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسانی فہم کا قائم کردہ

نظام حیات اپنی انتہائی بلندیوں تک پہنچ کر بھی پستیوں سے نہ نکل سکا۔

اختر۔ جی ہاں، اس وقت آپ کی فہم اسی پستی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔
(وہ مسکراتا ہے)

محمود۔ لیکن میں نے آپ کی فہم کو تو اس سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا ہے۔
(سب ہنستے ہیں) مجھے اس کا اعتراف ہے۔ اسی لئے تو میرا معروضہ یہ ہے کہ مالکیت، حاکمیت، سلطانی، اقتدار، افتخار وغیرہ سب کچھ نہ صرف فرد سے بلکہ تمام بنی نوع انسان سے چھین کر مالک حقیقی کے حوالے کر دینا چاہیئے تاکہ عالمی مساعی میں بنی نوع انسان کا احساس اس کے سوا اور کچھ نہ رہے کہ "جو کچھ ہے وہ رب العالمین کا ہے، اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ بھی اسی کا ہے، میرا کچھ بھی نہیں میری عبادت سے لے کر زندگی کی ہر حرکت یہاں تک کہ جینا اور مرنا سب اسی کے لئے ہے۔" کارگاہ حیات میں فقط انہیں نفوس کا وجود رحمۃ للعالمین بن کر معرکہ آرا ہو سکتا ہے، ہم نے یہی دستور حیات اللہ کے رسولؐ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے تحت جاری کردہ نظام حیات میں دیکھا ہے۔

منشی منیر۔ سبحان اللہ! جزاکم اللہ۔

عزیز۔ (مسکرا کر) جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔

محمود ۔ (مسکرا کر ڈاکٹر عزیز سے) ڈاکٹر صاحب! یہ آپ شعر خوانی چھوڑ دیئے اور میری بات سمجھیئے ۔

عزیز ۔ آپ کی بات خدا ہی سمجھے ۔

محمود ۔ (مسکرا کر) گستاخی معاف، اگر آپ اس طرح سمجھ کے دشمن بن جائیں گے تو میں معروضہ کیوں کر پیش کر سکوں گا؟

(سب ہنستے ہیں)

اختر ۔ بھائی عقل سے دشمنی کے تو آپ خود ہی دعویدار ہیں ۔ ڈاکٹر غریب کو کیوں پریشان کریں ۔

محمود ۔ (مسکرا کر، حاشا و کلّا! میرا مطلب قبلہ ڈاکٹر صاحب کو پریشان کرنا ہرگز نہیں ہے ۔ میرا معروضہ ان کی خدمت میں صرف یہ ہے کہ یہ عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ فقط علم و دانش کی رہنمائی دنیا کے درد کا درمان نہیں ہو سکتی ۔

عزیز ۔ آخر آپ نے عقل کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ عقل کو بے اصل قرار دے کر عقلمندی کا دعویٰ بھی تو غلط ہے ۔

منشی منیر ۔ عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں ۔

عزیز ۔ (منشی منیر سے) قبلہ شعر خوانی سے آپ کو کوئی منع نہیں کرتا لیکن اس میں بھی ذرا عقل کو دخل رہے ۔

(سب ہنستے ہیں)

منشی منیر (ڈاکٹر عزیز کی طرف دیکھ کر) میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ

آپ اپنی حد تک اس مطالبے میں حق بجانب نہیں ہیں۔
(ہاتھ جوڑ کر) لیکن عالی جاہ! میرا روئے سخن فقط اہلِ ذوق حضرات کی طرف ہے۔ گستاخی معاف کیجئے۔

(سب قہقہہ لگاتے ہیں)

اختر۔ (مسکراتے ہوئے) منشی صاحب! آپ میری بات پر دھیان دیجئے۔ جناب محمود صاحب سے میرا معروضہ یہ ہے کہ فقط انسان کی عقل و دانش نے زندگی کا سامان کیا ہے۔

منشی منیر۔ اور موت کا سامان بھی تو کیا ہے قبلہ!

اختر۔ آپ اس کے تعمیری پہلو کو کیوں نظر انداز کئے دیتے ہیں؟ انسان کی فہم کے آگے ساری کائنات سہمی ہوئی ہے۔

محمود۔ شاید میں اپنا عندیہ گوش گذار کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ جہاں انسانی فہم حیران رہ جاتی ہے وہاں اللہ کی کارسازی ہی کام آتی ہے۔

الطاف۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ اللہ کی کارسازی نے نظامِ زندگی کے پراگندہ گیسوؤں کو بارہا سنوارا ہے۔

منشی منیر۔ اور سچ پوچھئے تو زندگی کے اس انتشار میں انسان کے ضمیر کی صدا یہی ہے کہ الٰہی نظام کے بغیر زندگی کی گتھی سلجھ نہ سکیگی۔

عزیز۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) اللہ کی کارسازی کے حالیہ تماشے

شاید آپ کی نظر نے نہیں دیکھے۔
منشی منیر۔ شکر ہے کہ میری نظر نے یہ تماشے آپ کی نظر سے نہیں دیکھے۔
اختر۔ کاش کہ آپ کو حق بینی نصیب ہوئی ہوتی۔
منشی منیر۔ (مسکرا کر) میں آپ کی اس پر خلوص تمنا کا ممنون ہوں
اور میری بھی آپ کے لئے یہی دعا ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

عزیز۔ نیاز مندی کے تقاضے . . . .
اختر۔ انسان کی یہی نیاز مندانہ ذہنیت اسے عقل سلیم سے محروم
کر دیتی ہے۔
عزیز۔ انسان ٹھوکریں کھا کر بھی غیبی قوتوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔
الطاف۔ اصل میں ٹھوکریں کھا کر ہی یہ سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔
اختر۔ جی نہیں، انسان کی فکر و نظر جب مجہول ہو جاتی ہے تو وہ
غیبی سہارے ڈھونڈنے لگتا ہے۔ (منشی منیر کی طرف دیکھ کر)
منشی صاحب آپ کا شعر مجھے یاد آ گیا۔

کار ساز ما بہ فکر کار ماست
فکر ما در کار ما آزار ماست

اسی بے بسی اور بے چارگی کے احساس کی توہم پرستی "مرغے
از غیب بر دل آید و کارے بکند" کی ذہنیت پیدا کر کے
زندگی کو مفلوج بنا دیتی ہے۔

منشی منیر۔ آپ نے جو شعر میری طرف منسوب فرمایا ہے اس کا مطلب یا تو میں نہیں سمجھا یا آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔

اختر۔ مطلب آپ کا میں خوب سمجھا حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش صرف انسانی توانائیوں کی کارفرمائی دیکھ رہے ہیں آپ انہیں غیر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں (محمود کی طرف دیکھ کر) محمود صاحب! آپ کیوں خاموش ہو گئے؟

محمود۔ (مسکراتا ہے) میں سن رہا ہوں۔

اختر۔ آپ کو بولنا بھی تو چاہیئے۔ (سب مسکراتے ہیں)

محمود۔ میں کیا عرض کروں آپ اصل بحث سے بہت دور جا پڑے

اختر۔ جی نہیں، ہماری گفتگو کا مرکز خیال وہی ہے۔ میں انسان کی توانائیوں پر ایمان رکھتا ہوں، آپ اس کی بے چارگی کو رد رہے ہیں۔

محمود۔ میں یہی تو عرض کر رہا ہوں کہ آپ مجھے اس مقام پر دیکھ رہے ہیں جہاں میں نہیں ہوں۔ اب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے آپ کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

اختر۔ میرا نقطۂ نظر واضح ہے۔ میں انسان کو غیر کی محتاجی سے آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے کثرت کی غلامی سے آزاد کر کے وحدت کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ وحدت کا طلسم بھی ٹوٹ جائے اس لئے کہ انسان غیر کی

محکومی سے جتنا بھی آزاد ہوتا جائیگا اس کی صلاحیتیں اتنی ہی آشکارا ہوتی جائیں گی۔ اس کی زندگی کا کوئی پہلو خارجی محکومی قبول نہیں کرتا۔ اس کی فطرت آزاد کی سربلندیاں اسے معرکۂ وجود میں ہمیشہ غلبہ بخش رہی ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا ادنیٰ خادم بنا ہوا ہے ہم جس تخلیق کو فطرت کی بخشش سمجھتے ہیں، حقیقت میں اس کے تخریبی عنصر کو تعمیر کا رنگ دینے والا فقط انسان ہی ہے۔ اس کی قبیح شکل کو حسن بخشنے والا یہی بحر و بر کا سلطان ہے۔ فطرت کی تخلیق میں تاریک راتیں بھی ہیں جنھیں انسانی لیمپ ہی روشن کر سکتے ہیں۔ اس کی قلمرو میں بڑی بڑی بھیانک چٹانیں بھی ہیں جن کی بے رونقی کو انسانی ہاتھ ہی خوبصورتی بخش سکتا ہے پتھروں سے شیشے کی صنعت گری اور نیش کو نوش کی تاثیر بخشنے کا کرشمہ اسی سے ظہور میں آیا ہے۔ (اختر محمود کی طرف دیکھتا ہے)

محمود ۔ (مسکرا کر اختر سے) آپ فرمایئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔

(سب مسکراتے ہیں)

اختر ۔ میں آپ کی ہمہ تن گوشی کا ممنون ہوں۔ (سب ہنستے ہیں)

محمود ۔ یہ آپ کی عنایت ہے۔

اختر ۔ عرض کردوں؟

محمود ۔ ارشاد!

اختر ۔ یہ گرجنے والی توپیں، دندناتے ہوئے انجن، زبردست طیارے، سمندر کے سینے کو چیرنے والے جنگی جہاز، برق رفتار آبدوزیں اور اسی نوع کی ہزاروں لاکھوں انسانی کاوشیں اور اس کی تخلیقی صلاحیتیں اپنی قیامت خیز تسخیری قوت کے ساتھ انسان کی خدائی کا اعلان کر رہی ہیں۔ پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر ۔ جوہری قوتوں والا انسان آپ کے خدائی تخیل کو دعوت پیکار دے رہا ہے...

محمود ۔ (کچھ سکوت کے بعد مسکرا کر) تو آخر آپ نے ختم ہی کر دیا۔ واللہ، آپ کی توپوں کی گرج اور جوہری بم کی ہیبت سے ہم کیا ساری کائنات لرز رہی ہے۔ لیکن آپ نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ انسان کی صلاحیتوں کے امکانات پر میرا ایمان آپ کے ایمان سے کمتر ہے؟

اختر ۔ اگر میں یہی جانتا ہوتا تو اتنی بکواس کیوں کرتا۔

محمود ۔ (مسکرا کر) اچھا تو اگر آپ تجدید ایمان کا مطالبہ ہی کر رہے ہیں تو یہ لیجئے میں آپ ہی کے ہاتھ پر تجدید بیعت کئے لیتا ہوں۔ (سب ہنستے ہیں)

اختر ۔ (مسکرا کر) خوب! تو آپ اپنے اس ایمان کا مظاہرہ فرمائیے۔

(محمود مسکراتا ہے)

محمود ۔ انسان کی عظمت پر میرا ایمان حق الیقینی کا درجہ رکھتا ہے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ قدرت کے عطا کردہ اسباب سے انسان سب کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے! اس ہیمانی پتلے کی سرشت میں کوکبی اور مہتابی شان جلوہ گر ہے۔ عالم ملکوت پر اس کی برتری اس کے بلند مقام کو ظاہر کر رہی ہے۔ انسانی جلال کے آگے پہاڑوں کی بلندیاں سرنگوں ہیں۔ طوفانی دریا اس کی راہ سے گریزاں ہیں۔ سمندروں کے سینے اس کی ہیبت سے پھٹے جا رہے ہیں۔ زمین کا چپہ چپہ اس کے رزق کا سامان کرنے میں اس کا ادنیٰ خادم بنا ہوا ہے۔ آفتاب کی تمازت، ہواؤں کا چلنا اور ابر گہربار کا برسنا، آسمانی بزم کی آراستگی، ستاروں کی جگمگاہٹ اور مہتاب کی ضیا پاشی، یہ سب کچھ اسی کی خاطر ہے۔

منشی منیر۔ سبحان اللہ۔ آپ نے انسان کی عظمت میں چار چاند لگا دیئے۔

اختر۔ (مسکرا کر) طرز بیان کی شگفتگی ملاحظہ ہو۔

محمود ۔ (مسکرا کر اختر سے) معاف کیجئے میں طرز بیان کی داد چاہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میرا مطالبہ اس سے بلند ہے۔

(اختر مسکراتا ہے)

عزیز ۔ یقیناً۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم رنگ تقریر ہی جاذب توجہ ہے۔
الطاف ۔ (مسکرا کر) بہر حال رنگ تقریر ہی سہی۔ کچھ تو جاذب توجہ ضرور ہے۔
محمود ۔ (ڈاکٹر عزیز سے مسکرا کر) آپ کی ستایش گری کی داد تو میں نہ دوں گا البتہ اس زحمت فرمائی کا ممنون ضرور ہوں۔
اختر ۔ (محمود سے) تو ارشاد فرمائیں ۔ کیوں، ختم کر دیا؟
محمود ۔ (مسکرا کر) جی نہیں مجھے تو آپ کو تھکانا مقصود ہے۔
اختر ۔ آپ یقین کیجئے میں زندگی میں بحث سے کبھی نہیں تھکا۔ آدمی حجتی واقع ہوا ہوں۔
محمود ۔ (مسکرا کر) شکر ہے کہ اس کا آپ کو خود اعتراف ہے۔ اچھا تو اب اطمینان سے بیٹھئے۔
اختر ۔ ارشاد!
محمود ۔ جب انسان اپنی بے پایاں صلاحیتوں کے تھا اپنی جولانگاہ زیر آسمان ہی محدود کر لیتا ہے اور رنگ و بو کی تسخیر میں اندھا بنکر مادیت کے بت پر ہر چیز کو بھینٹ چڑھانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے تو اس کی تسخیری قوتیں بے معنی اور بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔
اختر ۔ اب آپ نے انسان کی سابقہ بیان کردہ عظمت کو مسخ کرنا شروع کر دیا ہے۔

محمود - جی نہیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ انسان کی فطرت کے کمال کی داستان آپ اپنی زبان میں سنیں تو لیجئے میں الفاظ کی ترکیب و ترتیب کو بدلے دیتا ہوں۔ انسان کی وسعت بلند نظری کی دعوت دیکر اس کے حوصلوں سے آسمان کے تارے اتار لانے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ وہ اسے نیلگوں فضاؤں سے پرے کمندیں ڈالنے کے لئے ابھار رہی ہے۔ جہان نو کی تسخیر کا جنون انسان کی روح کو مادی آلائشوں سے پاک کر کے حیات سرمدی کی بخشش کے لئے بلند پروازی کا ناقابل تسخیر حوصلہ عطا کرتا ہے۔ جب طائر لاہوتی کے یہ بند کھل جاتے ہیں تو اس کی سلطانی کے حدود بحر و بر کی سطح تک ہی نہیں رہتے۔ اس کی زد میں ساری کائنات آجاتی ہے۔ انسان کی صلاحیتوں کو اس حد تک اجاگر کئے بغیر بلند نظری کے دعوے باطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ زندگی کی اس کیفیت کے بغیر کار ہستی کو زبونی سے مفر نہیں۔ انسان ازلی صداقتوں سے رشتہ جوڑ کر ہی اس بلند مقام کا دعویدار ہو سکتا ہے جس کا وہ واحد حقدار ہے۔

اختر - لیکن یہ ازلی صداقتوں کے پردے میں آپ آزادی افکار کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ نیازمندانہ شان والا انسان "انا" کی توہین کر رہا ہے کسی بارگاہ کی بندگی اس کی

تسخیری قوتوں کو بے آبرو کر دیتی ہے۔

عزیز۔ (اختر کی طرف دیکھ کر) وہ کیا شعر تھا اختر صاحب!
بندگی میں گھٹ کے . . . . . .

(سب ڈاکٹر عزیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں)

اختر۔ (مسکرا کر) بندگی میں گھٹ کے رہجاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

منشی منیر۔ (مسکرا کر) ماشاءاللہ! ڈاکٹر صاحب، خوب یاد دلائی فرمائی۔ (اختر کی طرف دیکھ کر) لیکن کم از کم اختر صاحب کو یہ شعر نہیں پڑھنا چاہیئے تھا۔ (سب ہنستے ہیں)

محمود۔ (اختر سے) ہاں تو آپ کو بندگی سے بیر ہے، بہت اچھا۔ لیکن انسان کے فہم نے افراط و تفریط میں پڑ کر ہی ہمیشہ دھوکا کھایا ہے۔ دراصل انسان جو چیز اپنے اندر تربیت سے سنوارتا ہے وہ اس کی تخلیق نہیں کہی جاسکتی۔ وہ فقط فطرت کی ودیعت کردہ صلاحیت کا ظہور ہے۔ اور انسان کے یہ پوشیدہ خزینے جتنے کھلتے جائیں گے وہ اتنا ہی ظاہر ہوگا۔ ایک حقیر سا دانہ اپنے اندر برگ و بار پیدا کرنے کی پوری صلاحیت لیکر بھیجا گیا ہے۔ اس صلاحیت کی تخلیق اس دانے کا اپنا فعل نہیں ہے۔ صناعی صرف ایک ہی صانع کا کام ہے۔

منشی منیر۔ وحدہٗ لا شریک لہٗ۔

محمود۔ اس ایک صانع کی خدائی کو تسلیم نہ کرنا حق و صداقت سے منہ موڑنا ہے۔ اگر انسان خدا ہوتا تو اس سے بہتر اور کیا ہوتا؟ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ غریب خدا نہیں ہے۔

(سب مسکراتے ہیں)

منشی منیر۔ سبحان اللہ، جزاکم اللہ۔

اختر۔ (محمود سے) تو گویا آپ اپنے قتل کے محضر پر دستخط ثبت فرما چکے۔

محمود۔ (مسکرا کر) ابھی دستخط کا موقع نہیں آیا۔ تھوڑا سا بیان باقی ہے۔

(الطاف اور عزیز مسکراتے ہیں)

اختر۔ تو وہ بھی سنا دیجئے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

محمود۔ سارا جھگڑا اسی قیاس کا تو ہے۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ جہاں انسان کی برتری کے آگے ساری کائنات جھکی ہوئی ہے وہاں وہ کبھی خود کو قانون فطرت کا زنجیری پاتا ہے۔ اس کی ولادت اور موت کے علاوہ اس کے جسم میں مختلف اعضاء و جوارح کا عمل اس کی بے اختیاری کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان اپنی

بے پایاں آزادئ عمل کے باوجود کائنات کے ذرے ذرے
کے ساتھ طوعاً وکرہاً قانون فطرت کا پابند بھی ہے۔
اسی لئے اس بے اختیاری کو مدِ نظر رکھ کر آزادیٔ
عمل کے بے پایاں امکانات کو کسی بارگاہ کا عطیہ
سمجھنا بھی ضروری ہے۔

اختر۔ آخر لے دے کر آپ نے وہی ایک بات دہرا دی۔
لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کے ارادوں کی
بے پناہ قوتیں قانونی شکنجے توڑ دیتی ہیں۔ اس کی فطرت
آزاد پابندیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

محمود۔ انسان کا ہر عمل بے نتیجہ ہے اگر وہ بے لگام ہے۔

اختر۔ یہ بے لگامی کا لفظ آپ کو کہاں سے مل گیا؟ اس گمراہ کن
لفظ کو لغت سے خارج کر دینا چاہیئے۔

(سب مسکراتے ہیں)

محمود۔ (مسکراتے ہوئے) یہ لیجئے میں خارج کئے دیتا ہوں۔ انسانی
حدود سے باہر اس کی ہر تدبیر بے نتیجہ ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

اختر۔ انسانی تدابیر کی حدیں نہیں ہوتیں۔

محمود۔ تو ان کے لئے حدیں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانی
تدبیر کی نا تربیت یافتہ کاوشوں نے اپنے انتہائی کمال

سکے باوجود گم کردہ راہی اور زبوں کاری کے سوا کیا پایا۔ اس کی قیامت خیز جدوجہد سے آسمان کانپ اٹھا، زمین تھرا گئی، انسان کے کلیجے ہیبت سے پھٹ گئے۔ لیکن آخر کار انسانی تدابیر کی بے پناہ قوتیں اپنے عمل کے تخریبی نتائج سے خود کو بھی نہ بچا سکیں۔ اسرار حیات کی تاریکیوں کو علم و دانش کے آفتابوں سے روشن کرنے والا انسان غلط بینی کا شکار ہو کر حرماں نصیبی کی آپ اپنی مثال بن کر رہ گیا۔ فطرت انسان کی نظروں سے فریب کے پردے یکے بعد دیگرے اٹھاتی جا رہی ہے کہ وہ غور و فکر سے نہیں تو مشاہدے ہی سے انسانی تدابیر کی رسوائیاں دیکھ لے۔

اختر۔ لیکن اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو قوم اپنی توانائیوں کی ناقابل تسخیر کیفیت کو زندگی کی معنوی پابندیوں سے مغلوب کرنا چاہتی ہے، اسے زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

محمود۔ (مسکراتے ہوئے) آپ کے اس نیک خیال سے کس بدبخت کو اختلاف ہے۔

اختر۔ اس عدم اختلاف کے باوجود اتفاق بھی تو نہیں ہے۔

محمود۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔

منشی منیر۔ (مسکرا کر) اختر صاحب کی نفی میں بھی اثبات کا پہلو نکلتا ہے (اختر سے) اگر اجازت ہو تو ایک شعر عرض کروں۔

اختر۔ (مسکراتا ہے) آپ کی عنایت کا ممنون ہوں۔ ارشاد۔

منشی منیر۔ آپ کی قدر دانی کا شکر گذار ہوں۔ (سب مسکراتے ہوئے منشی منیر کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

(اختر سے) بھائی سید زادے ہو برا نہ ماننا۔ شعر عرض کرتا ہوں

شیخ کو بھی اس بت کافر نے اپنا کر لیا۔

دین سے کیا ہو سکا ایمان نے کیا کر لیا۔

(سب قہقہہ لگانے ہیں)

منظر ششم

[اختر کے مکان کا ڈرائنگ روم۔ اختر اور ڈاکٹر عزیز صوفے پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان ایک چھوٹی تپائی ہے جس پر اخبار اور سگریٹ کا ڈبا رکھا ہوا ہے۔]

عزیز۔ (مسکرا کر) ظالم نے ابھی نظر اٹھانا بھی تو نہیں سیکھا۔

اختر۔ اس لیے کہ اس کے حسن کو کسی ہوسناک تمنا نے مسخ نہیں کیا۔ اس کی ایک ایک ادا اس کے ہوش ربا حسن کی کرشمہ سازیوں کا دلفریب نظارہ ہے۔ (مسکراتا ہے)

عزیز۔ (ہنستا ہے) یہی تو آپ کا حسن بے پرواہ ہے۔
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے۔

اختر۔ (سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ) جی ہاں، یہ آپ کا حسن خود بین نہیں۔ اس کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا کچھ بھی تو اس کے بس میں نہیں ہے۔

عزیز۔ (مسکرا کر) تو گویا حسن کے ساتھ عشق بھی بے خود ہوا جاتا ہے

اختر۔ (ٹالتے ہوئے) یہ حقیقت ہے کہ اس کی فطرت ابھی محفل آرائی سے گریزاں ہے۔

عزیز۔ جی ہاں، وہ پردہ نشینی کی بھی تو قائل ہے۔ وہ فطرۃً آپ کی

اہلیہ محترمہ کی ہم خیال ہے۔ (وہ ہنستا ہے۔ اختر مسکراتا ہے)
وہ چھپنا ضرور چاہتی ہے۔ دیکھا نہیں، ہر آڑ اس کے لئے
سہارا بن جاتی ہے۔

اختر۔ درحقیقت حسن کی فطرت حجاب کی متقاضی ہے۔

عزیز۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) آپ تو بیگم حفیظ کو دعائیں
دیجیے۔ کتنی معصوم روح! فطرت کا نکھار اسی کو
کہتے ہیں۔ واللہ! بڑی قیمتی جنس بازار میں آئی ہے۔
لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ ابھی مرد کی صحبت سے گریزاں
ہے۔ (اختر کی طرف غور سے دیکھ کر) تم خاموش کیوں ہو گئے؟
تصور ہی میں مسحور ہوئے جاتے ہو؟

اختر۔ ابھی اس غریب کی نظر مرد سے دوچار ہی کب ہوئی!

عزیز۔ (مسکراتا ہے) یعنی مرد کی نظر کا جادو ابھی اس پر نہیں
چلا۔ دیکھا نہیں، بیگم حفیظ کو چھوڑنا اسے ایک پل گوارا
نہیں۔

اختر۔ بات یہ ہے کہ . . . .

عزیز۔ میری بات تو سنیئے ۔ مرد کی نظر کا جادو اس پر نہیں
چلا لیکن اس کی نظر کا جادو غریب مرد پر چل گیا۔

(وہ بے اختیار قہقہہ لگاتا ہے)

اختر۔ (ہنستے ہوئے) لیکن . . . . . .

عزیز۔ لیکن مرد کا منصب تو تسخیر کرنا ہے مسخر ہونا نہیں۔
اختر۔ (اس کے چہرے پر سنجیدگی پھیل جاتی ہے) کتنی بدبخت ہے دنیا جہاں حیدروں کے نور سیاہیوں میں تبدیل ہو چکا ہیں۔
عزیز۔ ماشاءاللہ! کتنا تضاد ہے قول اور فعل میں!.... اب آپ کے اندر رشک بھی کام کر رہا ہے۔ ذرا ہوش میں آیئے۔ (مسکراتا ہے)
اختر۔ (مسکرا کر) تم بڑے مسخرے آدمی ہو۔ تم سے سنجیدہ گفتگو کیوں نہیں ہو سکتی؟
عزیز۔ (ہنستا ہے) بھائی تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ڈاکٹر کے حضور میں گفتگو کر رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم "ہر خیر مرے لئے ہے" کے قائل ہو۔ یہی آپ کے سلیم الطبع ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ آپ کی نت نئی فریفتگی دیرپا بھی تو نہیں ہوتی۔ تمہاری فطرت تازہ بہ تازہ، نو بہ نو کی ہوس سے سرشار ہے۔ جس حسن کے حجاب نے تمہیں مسحور کیا اسے آخر تم نے کتنا بے حجاب بنا دیا! آج اس ظالم کی بے حجابیاں کلب کی جان بن گئی ہیں۔ لیکن وہ غریب تمہاری جان بنکر نکل گئی۔ اب تم بیگم حفیظ کو چھوڑ کر مس طاہرہ پر جان دینے لگے۔ اچھا، بتاؤ تم نے ان معصوم جذبات کے ساتھ ایسے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں

اختر۔ (ہنستا ہے) تم اپنی نہیں سناتے؟

عزیز۔ ڈاکٹر کی جنت کو تم کیا پوچھتے ہو! ڈاکٹر کا گذر وہاں ہے جہاں آپ کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔

اختر۔ (مسکرا کر) تم نے سچ کہا۔ لیکن ڈاکٹر حسن کو کسی اور نظر سے دیکھتا ہے۔ اس غریب کی قسمت میں نظارگی کے لطیف شعور کا ابدی سرور نہیں۔

عزیز۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) ماشاء اللہ! آپ مغالطے میں بھی مبتلا ہیں۔ تم اپنی ہوس پرستی کو پاکیزگی اور لطافت کے رنگ میں دیکھ رہے ہو؟ ایک ڈاکٹر ہی کو کیوں نام کرو۔ ڈاکٹر کی نظر آپ کی نظر سے کچھ بھی مختلف نہیں۔

اختر۔ (مسکراتا ہے) تم میری بات سمجھے نہیں۔ جذبات کی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔ دراصل میرے تخیل کی تمہیں ہوا بھی نہیں لگی۔

عزیز۔ (ہنستے ہوئے) بہت خوب! آپ ذرا خیال سے گذر کر عمل کی طرف تو نظر کیجئے۔

اختر۔ تخیل کی سرمستیوں کا تمہیں شعور ہی نہیں۔

عزیز۔ (مسکرا کر) لیکن تخیل سے زیادہ مشاہدہ حسین ہے اور مجاز سے زیادہ حقیقت دلفریب۔

اختر۔ سبحان اللہ! یہ آپ کی نظر میں مجاز اور حقیقت کی اصل

بھی تو نرالی ہے۔

عزیز۔ اب آپ اپنی شاعری کو رہنے دیجئے اور بتائیے کہ اس حسن کی خریداری میں کتنا سرمایہ لگانے کو تیار ہیں؟

(اختر کی طرف دایاں ہاتھ بڑھاکر) اچھا پہلے مجھ سے ہاتھ ملاؤ (اختر ہاتھ ملاتا ہے۔ دونوں ہنستے ہیں) کہو مشاہدے کی تاب ہے؟

اختر۔ خدا کی قسم! تم آج بڑی اچھی باتیں کر رہے ہو۔

عزیز۔ یہ آں محترم کا صدقہ ہے۔ اور آپ نے ڈاکٹر کو کیا سمجھ رکھا ہے؟

(دونوں ہنستے ہیں۔ اختر تپائی پر سے اخبار اٹھاکر ڈاکٹر عزیز کو دیتا ہے۔)

اختر۔ آپ اخبار دیکھئے۔ میں آتا ہوں۔ (وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے)

عزیز۔ (مسکراکر) شکریہ۔

(اختر چلا جاتا ہے)

"منظر ہفتم"

(اختر کے مکان کا زنانہ دالان۔ اختر اور عابدہ مونڈھوں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ان کے درمیان ایک چھوٹی میز پر گلدستہ رکھا ہوا ہے، قریب ہی دیوار سے لگا ہوا ایک تخت ہے جس پر غالیچہ بچھا ہوا ہے اور گاؤ تکیے لگے ہیں)

اختر۔ (عتاب آمیز لہجے میں) یہ بدبختی تو زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

عابدہ۔ یا اللہ! اب میں آپ کو کیوں کر سمجھاؤں!

اختر۔ کوئی سمجھ کی بات بھی تو ہو۔

عابدہ۔ تو آپ ہی بتائیے کہ میں اس سے زیادہ کیا کر سکتی ہوں

اختر۔ تم سب کچھ کر سکتی ہو، لیکن کرنا جو نہیں چاہتیں۔

عابدہ۔ برا نہ لگے تو عرض کروں کہ یہ جو آئے دن غبن کے قصے کھڑے ہوں گے تو جیل کا منھ نہ دیکھنا ہوگا؟

اختر۔ (بگڑ کر) تم اس کی فکر کیوں کرو؟ بدبخت عورت!

عابدہ۔ یہ آپ اس ڈاکٹر اور اس کی ذریات کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔

اختر۔ تم نے فقط ایک ڈاکٹر کا پیچھا پکڑ رکھا ہے۔

عابدہ۔ آپ کی اس خوش اعتقادی پر حیرت ہے۔ نوکری ملتے ہیں تو اس ڈاکٹر کے توسط سے، جاسوس، جھوٹے، چور، نرے ہی۔ خدا جانے یہ آپ کا دوست آخر چاہتا کیا ہے۔

اختر۔ تو یہ نوکر ڈاکٹر کے جاسوس ہیں کیا؟

عابدہ۔ اب میں آپ کو تفصیلات بتانے سے رہی، اس کا کوئی نتیجہ بھی تو نہیں ہے۔

اختر۔ میں تمہارے مکر کی داد دیتا ہوں۔ سب کچھ ہو مگر بیوی کی شکایت نہ ہو۔ اس غریب نوکر کی بس یہی تو ایک خطا ہے۔

عابدہ۔ میں وہی تو کہہ رہی ہوں کہ فتنے کا جو بیج بویا گیا ہے وہ نہایت شر انگیز ہے۔

اختر۔ اس کی ذمہ دار تم خود ہو، ڈاکٹر غریب کو کیوں بدنام کرو۔

عابدہ۔ آپ کی اس بدظنی کو میں اپنی بدبختی پر محمول کرتی ہوں۔

اختر۔ یہ بدبختی تو تم نے اپنے ہاتھوں مول لی ہے۔ اس ڈاکٹر نے میرے ساتھ وہ کیا جو تم سے بھی نہ ہو سکا۔ اب تمہیں کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں رہا۔

عابدہ۔ یہی نا کہ بلا وجہ قرض کی بلا میں مبتلا کیا۔

اختر۔ تم اب ان معاملات میں دخل دینا بالکل چھوڑ دو۔

عابدہ۔ اس بدنصیب کو اس کا موقع ہی کب حاصل ہے۔ آپ

حضور میں باریابی بھی تو آسان نہیں رہی۔ یہ نوازش تو صرف صلواتیں سنانے کی خاطر ہوتی ہے۔ دو بجے رات سے پہلے نہ آنے کی آپ نے قسم کھا رکھی ہے۔ اور پھر واپسی جس حال میں ہوتی ہے اس کا آپ کو بھی تو ہوش نہیں ہوتا۔

اختر۔ (برافروختہ ہو کر) بس بس خبردار! (عابدہ خاموش ہو جاتی ہے) ...... تم ان باتوں کو چھوڑو اور میرے سوال کا جواب دو۔

عابدہ۔ دس ہزار تو آپ کو مل ہی چکے، اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے۔

اختر۔ (بگڑ کر) تمہارے پاس قارون کا خزانہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محمود کی دیدہ دلیری فقط تمہارے اشارے پر ہے۔ یہ ہزاروں کا پریس، لاکھوں کی شان آخر کس کے دم سے ہے؟

عابدہ۔ ان میں سے کوئی چیز میری نہیں ہے۔

اختر۔ (چہرے سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے عتاب آمیز لہجے میں) جی ہاں، زیورات کو الگ کرنا تمہیں گوارا ہو گیا لیکن محمود کا دل دکھانا منظور نہ ہوا۔ میں تمہاری اس ہٹ دھرمی کا مطلب سمجھتا ہوں۔

عابدہ ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) یا اللہ! یا اللہ! میری بدنصیبی تو یہ ہے کہ آپ میرا مطلب ہی نہیں سمجھتے۔

اختر ۔ (غضبناک ہو کر) اچھا تو یہ یاد رہے کہ اب تمہاری پھوپھی تم سے نہ مل سکے گی۔

عابدہ ۔ اُسے ... ہے وہ تو آپ کے لئے آنکھیں بچھاتی ہیں۔

اختر ۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میری راہ میں کانٹے بچھا رہی ہے۔ وہ چڑیل اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔

عابدہ ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) یا اللہ! ... آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔

اختر ۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔

(عابدہ خاموش ہو جاتی ہے، اس کے چہرے سے انتہائی رنج و ملال ٹپکتا ہے)

منظر ہشتم

(ڈاکٹر عبدالعزیز کے دواخانے کا ایک چھوٹا کمرہ۔ کمرے کے وسط میں ایک میز ہے جس کے چار طرف چار کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر عزیز ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کے مقابل دوسری کرسی پر اختر ہے۔ عزیز کی پشت پر دیوار میں ایک کھڑکی ہے، اور سامنے دروازہ ہے، جن میں پردے پڑے ہوئے ہیں۔)

عزیز۔ (سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے) مگر بھائی اختر عزت بھی اور لاکھوں پائے۔

اختر۔ آخر یہ خسارہ میں کب تک بھرتا رہوں گا؟

عزیز۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔

اختر۔ میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں۔

عزیز۔ حساب میں بدعنوانیاں ہیں، اس کا انکار مجھے بھی نہیں ہے، ذرا معاملات درست تو ہو لیں۔

اختر۔ تو کیا معاملات درست ہونے ابھی باقی ہیں؟ بہت خوب! اسی وجہ سے تو اب مجھے ان خدمات سے وحشت ہونے لگی ہے۔

عزیز۔ (کچھ بگڑ کر) اب تم خواہ مخواہ وحشت پیدا کر لو تو کوئی

کیا کر سکتا ہے۔ ضرورت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ ابھی علیحدگی کا خیال نہ فرمائیں۔
اختر۔ آپ کی ضرورت اور میری مصیبت۔
عزیز۔ (خفگی سے لہجے میں) اس کے برعکس ضرورت آپ کی ہے، اور مصیبت میری۔
اختر۔ تو آخر آپ خفا کیوں ہو گئے؟
عزیز۔ آپ بات ہی ایسی کرتے ہیں۔ آپ کے اعزاز کی فکر مجھے دامن گیر ہو اور اس کے ساتھ صلواتیں سننے کی پریشانی بھی میری قسمت میں لکھی جائے!
اختر۔ نہیں میرے اعزاز کی فکر دامن گیر ہے اور مجھے حسابات کی بدعنوانی، بدنظمی، بدنامی اور اس کے نتائج کا سامنا ہے۔
عزیز۔ بدنامی کس امر کی؟
اختر۔ یہ بدنامی نہیں تو اور کیا ہے؟
عزیز۔ اس کی تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔
اختر۔ جی! تو آخر منشی صاحب کو کیوں کر معلوم ہو گیا؟
عزیز۔ (چہرے سے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے) قبلہ! یہ نتیجہ ہے آپ کی غربا پروری کا۔ میں نہ کہتا تھا کہ اس مردود کا انجمن کے دفتر میں بیٹھے رہنے کا کیا مطلب ہے؟
اختر۔ تو آخر ہوا کیا ہے؟

عزیز۔ وہی ہوا جو آپ فرما رہے ہیں۔
اختر۔ تو اس میں اس غریب کا قصور ہی کیا ہے؟
عزیز۔ یہی کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔
اختر۔ آخر گھر کا ایسا بھیدی ہی کیوں ہو؟
عزیز۔ کس گھر میں بھید نہیں ہوا کرتا؟
اختر۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔
عزیز۔ اب میں اس کو کیا کروں؟ نہ معلوم یہ آپ نے اس منشی کو کیوں منھ لگا رکھا ہے۔ حیثیت دو کوڑی کی نہیں، لیکن جب دیکھئے بس سر پر سوار ہے۔ اس بے ایمان کی ایمانداری تو یہیں ظاہر ہو گئی کہ بیٹی کو دفنائے ہوئے دو ماہ کا عرصہ ہو گیا قسم لو جو فیس کی ایک کوڑی بھی ادا کی ہو۔
اختر۔ تمہارا حافظہ بھی تو کام نہیں کرتا۔ غریب سو روپئے تو ادا کر ہی چکا ہے۔ اور کیا چاہتے ہو؟
عزیز۔ یہ تو آپ نے مرحمت فرمائے، اور سو روپئے میں حساب بے باق ہو گیا؟
اختر۔ اگر تم اسے بے ایمان سمجھتے ہو تو میں کہوں گا کہ مفلسی بے ایمان بھی بنا دیتی ہے۔
عزیز۔ (چہرے سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) بس آپ اپنی خوش فہمی رہنے دیجئے۔

اختر۔ (مسکرا کر) مگر ڈاکٹر کو اتنی سی بات پر برہم بھی تو نہ ہونا چاہیئے۔
عزیز۔ ڈاکٹر آخر انسان ہی تو ہے۔
اختر۔ (ہنستا ہے) اگر ڈاکٹر انسان ہوتا تو یوں برہم نہ ہوتا۔
عزیز۔ (ہنستے ہوئے) تم بڑے مسخرے آدمی ہو۔

(دونوں ہنستے ہیں)

اختر۔ (کرسی سے اٹھتے ہوئے) اب آپ تشریف لے جائیے، آپ کے مریض پریشان بیٹھے ہیں، اور مجھے بھی اجازت دیجئے۔
عزیز۔ (کرسی سے اٹھ کر ہاتھ ملاتا ہے) اچھا آداب عرض۔
اختر۔ تسلیم۔ تو اب کلب ہی میں ملاقات ہوگی؟
عزیز۔ واہ! خوب! بھول گئے؟
اختر۔ (مسکرا کر) جی، یاد آگیا۔ مناسب ہے، میں منتظر رہوں گا۔
عزیز۔ (مسکرا کر) اب آپ تشریف لے جائیے۔ آداب عرض۔

(اختر چلا جاتا ہے)

منظر نہم

[اختر کا مکان۔ وہی ملاقات کا کمرہ جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اختر صوفے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان سگار جل رہا ہے۔ داہنی طرف پاس ہی ایک چھوٹی سی دیدہ زیب تپائی ہے، جس پر ایک خوشنما چاندی کی طشتری رکھی ہوئی ہے۔ اندر کی طرف کے دروازے کا پردہ ہلتا ہے اور عابدہ پردہ ہٹاتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔

اختر سر اٹھا کر عابدہ کی طرف دیکھتا ہے]

اختر۔ (خفگی کے لہجے میں) استقبال کے لئے اٹھوں؟ یہاں میں منتظر بیٹھا ہوں۔ خادمہ کو دو مرتبہ بھیجا۔ اب آپ تشریف لائیں بھی تو کپڑوں کا یہ حال، چہرہ اداس، نہ غازہ نہ لالی، بھلی آدمی اب بھی تو تیار ہو جاؤ۔ آدھ گھنٹے کی تاخیر تو ہو ہی چکی ہے۔ عزیز اور ان کی بیگم منتظر ہوں گے۔

عابدہ۔ تیار کیوں کر ہو جاؤں؟

اختر۔ کچھ نہیں تو لباس ہی تبدیل کر لیا ہوتا۔

عابدہ۔ اے لو (لباس پر نظر کر کے) اس لباس کو آخر کیا ہو گیا؟ ابھی تو تبدیل کیا ہے۔

اختر۔ (خفگی کا اظہار کرتے ہوئے) ضدی عورت، کیا تم سمجھتی ہو یہ

کلب میں خواتین اسی حال میں پہنچتی ہیں۔ تم اتنا نہیں سمجھ سکتیں کہ ایسے موقع پر یہ کپڑے تمہیں زیب نہیں دیتے۔

عابدہ۔ خدا کی پناہ! ابھی لباس تبدیل کیا، اب حکم ہے کہ پھر تبدیل کیا جائے۔

اختر۔ آخر وہ قیمتی ساریاں کس کام آئیں گی؟

عابدہ۔ یا اللہ! میں اس نمائش اور زیبائش کی تقریب ہی نہ سمجھ سکی۔

اختر۔ عقل کی دشمن عورت، کبھی دوسروں کی عقل سے بھی کام لیا کرو۔

عابدہ۔ دوسروں کی عقل بھی کام نہیں آیا کرتی۔

اختر۔ (جھنجھلا کر) ہندوستانی عورت، تم کبھی تو ہو نہیں، غصے کو ضبط کرتے ہوئے) اب آپ کو کیونکر سمجھایا جاتا ہے؟ (عابدہ خاموشی سے کونے میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) اچھا تو اسی لباس میں چلی چلو اور اپنا تماشا بناؤ۔ تم مجلس کے آداب سے بے بہرہ ہو۔

عابدہ۔ (چیں بجبیں ہو کر) معاف کیجئے گا۔ میں اس مجلس اور مجلس آرائی سے باز آئی۔

اختر۔ (برافروختہ ہو کر) تم تو مطبخ کی ماما بننے کے لائق تھیں۔

عابدہ۔ (چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے) آپ کی عزت افزائی کی

ممنون ہوں۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔)

اختر۔ (سکوت کو توڑتے ہوئے مصالحانہ لہجے میں) آخر تم نے بیٹھے بیٹھے ایک ذرا سی بات کا خواہ مخواہ پہاڑ بنا دیا۔

عابدہ۔ جی ہاں، بات تو ہمیشہ ذرا سی ہی ہوتی ہے۔ مگر اس کا پہاڑ بھی ہمیشہ بنتا ہے۔

(اختر جلتے ہوئے سگار کو طشتری میں رکھ دیتا ہے)

اختر۔ یہ سب تمہاری عقلمندی کے کرشمے ہیں۔

عابدہ۔ مجھے تسلیم ہے۔ لیکن براہِ کرم اب مجھے اپنے حال پہ چھوڑ دیجئے۔

اختر۔ (تیوریاں چڑھا کر لہجے کو سخت اور آواز کو قدرے بلند کر کے)

جی ہاں، میں خوب جانتا ہوں کہ یہ سب گریز کے بہانے ہیں۔ یوں پیش نہ گئی تو دوسری راہ نکالی ہے۔ خواہ مخواہ جھگڑا اٹھانے کی تم نے پہلے ہی سے ٹھان رکھی تھی۔ لیکن تمہیں یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ تمہارا یہ مکرانہ چل سکیگا۔

(عابدہ ساکت و صامت بیٹھی رہتی ہے۔ اختر سکوت کے عالم

میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے۔)

میں سمجھتا ہوں کہ تم عنقریب دیوانی ہو جاؤ گی۔

عابدہ۔ (بھرائی ہوئی آواز کو قابو میں کر کے) اے تو اب کب دیوانی نہیں ہوں! تعجب تو یہ ہے کہ اس قیامت کے بعد بھی زندہ

جنون پیدا نہ کر سکا۔

اختر۔ تمہاری پہیلیاں کون بوجھ سکتا ہے۔ یہ عورت میری زندگی کا قلق بن کر رہ گئی ہے۔

عابدہ۔ یا اللہ! میں کوشش کروں گی کہ یہ قلق آپ کی زندگی سے دور ہو جائے۔ افسوس کہ عورت کے بے پایاں خلوص سے مرد کو آگاہی نہ ہو سکی۔

اختر۔ اس بدبخت سے خلوص کوسوں دور ہے۔

عابدہ۔ آپ کے اس خیال کی بنیاد صرف بدظنی پر ہے۔

اختر۔ بدظنی کی کوئی وجہ نہیں، فطرت کی لغزشوں میں ایک عورت کی تخلیق بھی ہے۔ تجربے نے یہی بتایا ہے کہ منافقت عورت کی سرشت ہے، مکاری اس کی ضرب المثل ہے اس کی جہالت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔

عابدہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غریب ہمیشہ مرد کی گرم گفتاری کا شکار رہی ہے۔

اختر۔ یہ اس کی جہالت کا نتیجہ ہے۔

عابدہ۔ آج مدتوں بعد آپ نے نوازا بھی تو اس طور پر کہ میں اپنا سب کچھ دے کر بھی آپ کی خوشنودی خرید سکتی ہوں نہیں۔ اپنی زندگی میں ایک زبردست خلجان محسوس کرتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زندگی کو کبھی مسکرانا تک نصیب نہ ہو سکا۔

اختر۔ مسکرانے کو کون منع کرتا ہے؟ یہ کمبخت مسکراتی کیوں نہیں؟ (جھنجھلا کر) اس بدبختی کو کس نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا؟

عابدہ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اس کے لئے میں اپنے وجود سے گلہ مند ہوں۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ اپنے شریک زندگی کی مسرت کے لئے کوئی سامان نہ کر سکی۔ میں نے بارہا اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جب ماحول نے تیرے لئے ایک مقام منتخب کر ہی لیا ہے تو زمان و مکان کی بندگی ہی سہی۔ مگر میں اپنے ضمیر کو اب تک مطمئن نہ کر سکی۔

اختر۔ تو یہ اطمینان کی گھڑی کب آئے گی؟

عابدہ۔ (اس کے چہرے پر شدید درد و کرب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں) اللہ بہتر جانتا ہے۔ آپ کو کیا خبر ہے کہ اس غریب کے سینے میں کیسا طوفان برپا ہے!

اختر۔ تو اس طوفان کے بند کھول کیوں نہیں دیتیں؟

عابدہ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) قفس عنصری سے روح کی پرواز بھی تو انسان کے بس میں نہیں ہے۔

[اختر تپائی کی طرف ہاتھ بڑھا کر ڈبے سے سگار نکال کر جلاتا ہے۔ وہ صوفے پر سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور دھوئیں کے حلقے بناتا ہوا خاموش گہرے سوچ میں بیٹھا رہتا ہے۔ عابدہ اپنی جگہ ملول بیٹھی ہوئی خاموش نظروں سے

کرے کے در و دیوار کا جائزہ لیتی ہے ۔]

اختر ۔ (عابدہ کی طرف دیکھ کر سکوت کو توڑتے ہوئے) مجھے اس کا انکار نہیں کہ عورت کی ذات میں پوشیدہ خزینے بھی ہیں مگر ضرورت ہے کہ انہیں پردوں سے نکال کر اجاگر کیا جائے ۔ ان صلاحیتوں کو آخر کیوں اندھیروں کے سپرد کیا جا رہا ہے ؟ زندگی کی چہل پہل اپنے ماحول میں عورت کے وجود کو ترس رہی ہے اور یہ شریف زادیاں سات پردوں میں چھپی ہوئی ہیں ۔ مشرق نے صدیوں کے بعد اب کہیں کروٹ بدلی ہے ۔ لیکن دقیانوسی نظام کے علم بردار اب بھی لکیر کی فقیری میں طرۂ امتیاز دیکھ رہے ہیں ۔

عابدہ ۔ (چہرے کو رومال سے صاف کرتی ہے) چونکہ آپ نے اس مسئلے کو ایک نئے ڈھنگ سے پھر چھیڑا ہے ، اس لئے مودبانہ اظہار خیال کی جرأت کرتی ہوں (اس کے چہرے پر عزم و استقلال کی لہر دوڑ جاتی ہے ۔) آج میں آپ سے صاف صاف اور بے باکانہ گفتگو کی اجازت چاہتی ہوں ۔

اختر ۔ بے باک آپ ازل سے رہی ہیں ، آج اجازت کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ؟

عابدہ ۔ (اس کے خوبصورت ہونٹوں میں پیچ و خم پیدا ہوتا ہے ۔ اس کی ابرؤوں میں خفیف سی جنبش ہوتی ہے ۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے ۔) یہ جو

میری فطرت کے متعلق آپ نے اپنے احساسات کا اظہار فرمایا ہے، میں اس کی شکر گذار ہوں۔ اس طبقے کی ترقی اور اس کے ابھار کے نیک منصوبے بھی باعث امتنان ہیں۔ میری فطرت بھی مجھ سے یہی مطالبہ کر رہی ہے کہ زندگی کی راہ میں کج روی سے باز رہوں۔ میں نے زندگی کی غایت اور اس کے مقتضیات پر بہت غور و خوض کیا۔ آپ کے ارشادات عالیہ کو بہ غور سنتی رہی۔ لیکن یہ میری کم نصیبی ہے کہ آپ کا نظریۂ حیات مجھے صراط مستقیم کا نشان نہ دے سکا۔

اختر۔ (مسکرا کر) ماشاء اللہ ہیں آپ کے صراط مستقیم، نظریۂ حیات اور مقتضیات زندگی پر بغیر جرح کئے آپ سے صرف اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس قرۃ العین، سرور محزوں، انبساط روح اور گرمیٔ محفل یعنی رونق زندگی کے لئے بزم ہستی کو اپنی ہمنشینی سے محروم رکھنے کا جواز کہاں سے نکل آیا ہے۔ فطرت کا عطا کردہ جمال اسے آرائش محفل کے لئے دعوت دے رہا ہے اس کا وجود اس سے گلہ مند ہے کہ شمع محفل ہو کے وہ محفل سے بے گانہ رہی۔ (عابدہ کی طرف غور سے دیکھ کر مسکراتا ہے۔) حسن اور دولت کی ملکہ آج بھی دنیا کو تسخیر کر سکتی ہے۔

عابدہ۔ (تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) تو گویا مرد اپنی انجمن کی بے رونقی

کورو رہا ہے۔ اس کا نفس نظر افروزی اور سامعہ نوازی کے سامان کے لئے ترس رہا ہے۔ اگر مرد کی نظر میں عورت کی یہی حیثیت ہے تو یہ عورت کی بڑی بدقسمتی ہے۔ وہ شرافت کا سرچشمہ جس سے باغ ہستی میں پاکیزہ خصائل کی آبیاری مقصود ہے، وہ مزرع حیات جس سے طیب فصل کی کاشت منشائے فطرت ہے، جس کا آغوش نکھرے ستھرے نونہالوں کی پرورش کا ضامن ہے، اس سے مرد کا یہ ہوسناک مطالبہ اس کی عزت افزائی نہیں کہا جا سکتا۔

اختر۔ میں تمہارے اخلاقی نظریوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں بیچارہ مرد عورت کی خاطر اپنی آنکھیں بچھائے ہوئے ہے اور آپ فرماتی ہیں کہ مرد کی یہ ذہنیت عورت کی عزت افزائی نہیں کہی جا سکتی۔

عابدہ۔ یہی صحیح ہے۔ اور اخلاقی نظریوں کو سمجھنا ایسا مشکل نہیں ہے۔ لیکن آج مصیبت تو یہ ہے کہ انسان اپنے نفسیاتی حقائق سے آنکھیں بند کئے خواہشات کی آندھیوں میں اڑا جا رہا ہے حق بینی اسے نصیب نہیں۔ جب ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ نفس کی ذرا سی تحریک پر ہم خوابیدہ فتنوں کے جاگ جانے کو روکنے پر قادر نہیں ہیں، انسان کے خیالات کی مسلسل بہنے والی نہر اپنے طوفانی ہیجان میں سمندر کے تلاطم سے بھی

آگئے ہے۔ تو پھر ایسی ہوائیں ہی کیوں چلائی جائیں کہ اس طوفان میں انسانیت ہی غرقاب ہو جائے۔

اختر۔ آخر آپ نے یہ خیالی طوفان کیوں برپا کرنے شروع کر دیئے ہیں؟ نفسیاتی حقائق سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔

عابدہ۔ لیکن اس حقیقت کا بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانے کی مسموم فضا انسان کے خیالات کی پاکیزگیوں کو ختم کرتی جا رہی ہے اور انہیں نظروں کے سامنے آپ اس غریب کو مائدۂ لذت بنا کر پیش فرمانا چاہتے ہیں۔

اختر۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) یہ گندگی اور پاکیزگی کیا شئے ہے؟ اگر زندگی کو اس نظر سے دیکھا جائے تو انسان کی زندگی میں پاکیزگی کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ جنسی رجحانات کے طوفان کو پاکیزگی کے علمبردار بھی تو نہ روک سکے۔

عابدہ۔ جی ہاں! وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا انسان کے لئے فرض عین ہے۔ یہ ایک سماجی ضرورت بھی ہے، جسے ازدواجی تعلق سے پورا کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر زندگی اپنے کمال سے محروم رہ جاتی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی غیر مسافحین، کی شرط بھی تو لگائی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ نفس پرستی کی خاطر نہ ہو۔ اس کے علاوہ جتنی راہیں ہیں وہ زندگی کے انتشار اور بالآخر اس کی موت

کا باعث ہیں۔

اختر۔ موت اور زندگی کی حقیقت بھی تو تمہاری نظر میں نرالی ہے۔ خیر اسے جانے دو۔ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ مرد کی ہمنشینی میں اس بدبخت کو کیوں تامّل ہے؟

عابدہ۔ ہاں اگر اس کی ضمانت مل سکے کہ انسان کی فطرت رذائل نفسانی سے بالاتر ہو گئی ہے تو اس غریب کو مرد کی ہمنشینی میں تامّل نہیں۔

اختر۔ (مسکرا کر) اچھا لو میں تمہیں اس کی ضمانت دئے دیتا ہوں۔

عابدہ۔ بہت خوب! ایک روشن ضمیر شخص عام لوگوں سے ممتاز صرف اس بنا پر ہے کہ وہ اپنے خیالات پر قابو رکھتا ہے۔ (مسکرا کر) کیا اس چودھویں صدی میں ساری دنیا روشن ضمیر ہو گئی ہے؟

اختر۔ اچھا اسے بھی جانے دو۔ (استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) لیکن یہ آپ کی عبادت کا آہنی حلقہ آپ کے پیش کردہ خطرات کے مقابلے میں زبردست دفاع کا سامان نہیں کرتا؟ کم از کم آنحترمہ کو تو اس سے خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

عابدہ۔ (مسکرا کر) اس پراگندہ دل، پراگندہ دماغ کی پاکبازی کو جانے دیجئے۔ حق تو یہ ہے کہ اس اختلاط کی ترغیب و تحریص کی دنیا میں قطب کی ولایت بھی مرد پڑ جاتی ہے۔

یہ جو انسان کے رگ و پے میں شیطان دوڑ رہا ہے اس کا کیا علاج کیجیۓ گا؟ - انسان کو رذائل نفسانی سے بالاتر کرنے کی ضمانت آپ نے دیدی۔ لیکن ہادیٔ کامل کے اسوۂ حسنہ اور خالق کائنات کے عطا کردہ دستور نے اسے ایسا نہیں سمجھا۔ صدیق اکبرؓ اور حیدر کرارؓ کو بھی نظریں نیچی رکھنے کا حکم رہا۔ قانون فطرت نے ان دو طبقوں کے درمیان حدّ فاصل قائم کر کے ان کے لئے جدا جدا مقامات اور الگ الگ حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ یہی ایک دوسرے سے آڑ فتنے کو عالم گیر بننے نہیں دیتی، اور فساد کی آگ کے لئے آندھیوں کا سامان نہیں ہونے پاتا۔

اختر۔ تمہاری نظر میں ایک بیچارہ مرد ہی تمام برائیوں کا منبع ٹھہرا۔ دنیا بھر کے خیالی طوفان تم نے اس غریب کے دل و دماغ میں بھر دیئے ہیں، اور اس عفت مآب عورت کو تم اس درندے سے بچانا چاہتی ہو۔

عابدہ۔ اے ہے! میں نے یہ تو نہیں کہا۔ مرد کی ذہنیت اور ماحول کی خرابی پر البتہ تنقید کی ہے۔

اختر۔ یہ آپ کی ملّت اسلامیہ کے زوال پر ہر شخص خون کے آنسو بہانے کا عادی ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی دنیا کو اس کا پورا احساس نہیں ہوا کہ ملّت کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری

عورت کی اس جہالت پر ہے کہ اس نے خود کو مجہول بنا کر کارگاہِ حیات میں عمل سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

عابدہ۔ لیکن تاریخ کے صفحات آپ کے اس بیان کی تصدیق نہیں کرتے۔ ملّت اسلامی کی تخریبی کارروائیوں میں عورت کا حصہ آپ کہیں نہ پائیگا۔ اس خصوص میں مرد کی کارگزاریوں سے تاریخ کی کتابیں رنگین ہیں۔

اختر۔ تم نے تاریخی حالات کو تحقیق کی نظر سے نہیں دیکھا۔

عابدہ۔ جی نہیں۔ تحقیق نے یہی ثابت کیا کہ اس قوم کے زوال کی داستان در اصل معاشرتی نظام میں اُن حیا سوز بے لگامیوں کے افسانے ہیں جو مردوں کی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان کے عشرت کدوں کے رنگین قصے آج بھی ہم فسانۂ عجائب' اور باغ و بہار' کی سی داستانوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ خود آپ کا ادب اس پر شاہد ہے۔

اختر۔ اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم نے مرد کے عشرت کدوں سے عورتوں کو کیوں خارج کر دیا۔

عابدہ۔ ہاں میری تمنّا ضرور ہے کہ میں انہیں ان ذلّت کے مقامات سے خارج پاتی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے' اس لئے کہ مرد کی استبدادی حکومت نے اس کمزور طبقے کو اس قید و بند سے رہائی کا موقع ہی نہ دیا اور اسے آلۂ تفریح

سمجھ کر جو جو مظالم اس کے ساتھ کئے ان کی تفصیل سے شرافت لرزہ براندام ہے۔ زندگی کے اس فاسد حصے نے نظام حیات کو پارہ پارہ کرکے آخر اس عالیشان عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس دردناک تباہی میں آپ عورت کا ہاتھ کہیں نہ پائیے گا۔ مرد کی سلطانی کے اس دور میں عورت کا وجود محض کسمپرسی کی حالت میں پایا جاتا ہے۔

دور ماضی میں مدعیان ایمان کی رنگ رلیاں پیرس کے منکریں کی بے حیائیوں کو شرما رہی ہیں۔ مردوں کی اسی بہیمیت پرستی پر کتنی معصوم دختران ملت کی ناموس قربان کی گئی۔ عورت کی شرافت اور اس کے نصف ایمان یعنی حیا کا لٹیرا مرد اپنی رذالت میں نہایت بیباک رہا ہے۔ آج بھی یہی ذہنیت بظاہر عورت کی حمایت کے بول بول کر انہیں غیر محفوظ مقامات میں لبانے کی فکر میں ہے۔ خدا کی پناہ! اس زنِ سادہ کے لئے کیسا پر فریب دام بچھایا جا رہا ہے۔

اختر۔ آپ کی عقل و فراست کے قربان! عورت کی وکالت میں آں محترمہ نے مرد کو کہیں کا نہ رکھا۔

عابدہ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قوم میں یہ جو تھوڑی بہت

شرافت پائی جاتی ہے انہیں مخدرات کے آغوش کی امانت ہے۔

اختر۔ عورت کی رجعت پسندی ضرب المثل ہے۔ اپنے طبقے کی بیجا حمایت تو خیر ایک حد تک قابل درگذر بھی ہے لیکن آپکی غلط بینی قابل معافی نہیں۔

عابدہ۔ جی، بے جا حمایت میرے مذہب میں گناہ عظیم ہے۔ تحقیق کی نظر میرے بیانات کی تصدیق کرتی ہے۔

اختر۔ تحقیق کی نظر نے اس باب میں صرف یہ دکھایا ہے کہ قوم کے نصف حصے کی جہالت اور جہلی نے دوسرے نصف حصے کو بھی ناکارہ بنا دیا کیوں کہ عورت کا آغوش قوم کی تربیت کا اچھا نمونہ پیش نہ کر سکا۔

عابدہ۔ یہ مجھے تسلیم ہے کہ اس جھوٹ میں تھوڑی سی سچ کی آمیزش ضرور ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی مرد ہی گردن زدنی ہے۔ مرد کی آسائش اور بچوں کی تربیت کا فریضہ عورت نے بساط بھر بخوبی انجام دیا۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ عورت کے سرپرست اور اس کے قیم یعنی مرد نے اس کے لئے کوئی مفید لائحہ عمل پیش نہیں کیا اور اس طرح وہ راہیں مسدود کر دیں جن پر اسے اپنی اولاد کو لگانا تھا۔ اسی لئے قوم کے نونہالوں میں عورت وہ روح نہ پھونک سکی

جس کے بغیر قوم بے جان ہو کر رہ گئی۔

اختر۔ سبحان اللہ! تو یہ زندگی کے لائحۂ عمل سے ہے عورت نے مرد کی محتاجی کیوں مول لے رکھی ہے اگر وہ اتنی ہی بے پایاں صلاحیت والی مخلوق ہے؟ عورت مرد کی کوتاہیوں کی پردہ نہیں بنا سکتی۔

عابدہ۔ جی ہاں! یہ صحیح ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت نے اب تک خود کو مرد کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور مرد نے عورت کو کبھی عورت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ عورت مرد کی نظر کے سحر کو توڑے اور خود کو اپنی نظر سے دیکھے اپنی فطرت کی صلاحیتوں کو پرکھے اور اپنی خودی کو آشکارا کر کے اپنے لئے خودداری کا مقام پیدا کرے کتاب زیست کے اوراق میں عورت کو اپنی سرنوشت اپنے ہی قلم سے لکھنی چاہیئے۔

اختر۔ تو گویا تم عورت کو مرد سے تصادم اور عدم تعاون کے لئے ابھار رہی ہو۔

عابدہ۔ جی نہیں، میں چاہتی ہوں کہ عورت اپنے لئے ایسا ماحول پیدا کرے جس میں اس کی عقل و صلاحیتیں سعادت کی راہ لگائی جا سکیں اور مرد کی کوتاہیاں اس کی ترقی کی راہوں کو مسدود نہ کر سکیں۔

اختر۔ اس کا آپ کو حق ہے۔ لیکن اس سعادت کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ اپنے فرائض سے منہ موڑ لے۔

عابدہ ۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ آپ کی نظر میں عورت کے فرائض وہ نہیں ہیں جو حقیقتہً ہیں۔ جب مرد عورت کا ذکر کرتا ہے تو مرد کے اپنے رجحانات اس کے خیالات پر غالب آجاتے ہیں۔ مرد کی نظر میں عورت کی حیثیت کیا ہے؟ وہ اس کے قلب و نظر کی روشنی ہے، دل کی ٹھنڈک ہے، گھر کی خادمہ ہے، دل بہلانے کا ایک کھلونا ہے، تفریح طبع کا ایک آلہ ہے۔ یا اللہ! اس بدنصیب مخلوق کو مرد نے کیا سے کیا بنا دیا!

اختر۔ ماشا اللہ! آج مجھے تمہاری چرب زبانی کا لوہا ماننا پڑا لیکن بڑا افسوس تو یہ ہے کہ اس کا سارا کمال غلط راستوں پر ڈالدیا گیا ہے۔ تم نے زمانہ ماضی میں عورت کے ساتھ مرد کے ظلم و ستم کی داستان بخوبی بیان کی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ زمانۂ حال کے انقلابی حالات میں آپ نے عورت کا بلند مقام ملاحظہ نہیں فرمایا۔ اس کے لئے دنیا بے پایاں ترقی کا سامان لئے ہوئے منتظر کھڑی ہے۔ اسے اپنے اس جائز حق کو ٹھکرانہ دینا چاہیئے۔

عابدہ ۔ خوب! آخر یہ تو معلوم ہو کہ اس کا جائز حق کیا ہے۔

اختر۔ اس کا تعین عورت خود کر سکتی ہے۔ لیکن عورت کو چاہیئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں پر نظر کرے۔

عابدہ ۔ اچھا تو لیجئے اب آپ عورت کو عورت کی نظر سے دیکھیئے۔
اگر قوم کی امانت فرزند صالح ہے تو عورت اس کی تنہا امانت دار ہے ۔ اس کے لئے دنیا کے شدید ترین آلام ومصائب کی ایک وہی علمبردار ہے ۔ حقیقت میں زندگی کا استحکام اسی کے درد و کرب کا مرہون منت ہے کہ اس تخلیق کی خاطر اس کی زندگی کتنی سکرات کی تکلیفوں سے گذر رہی ہے ۔ انسان کی زندگی کی صبح کو عورت کی شام زندگی ہی روشن کرسکتی ہے ۔ بزم ہستی کے ساز میں عورت کے نغمے نے جان ڈالی ہے ۔ اس کے نفس کا سوز ایک عالم کو دگر گوں کر رہا ہے ۔ اس کے سوز حیات نے معرکۂ وجود کے لئے کتنے ہی عمر کی تقدیر بدل دی ہے۔ زندگی اسی کے اشاروں پر رقص کرتی نظر آتی ہے ۔ زندگی کی مسلسل بہنے والی نہر کا پیچ و تاب اپنی موج و گرداب کے لئے اسی ایک منبع کا محتاج ہے ۔

اختر ۔ عورت کے اس مقام اور اس کے فرائض کو میں تسلیم کئے لیتا ہوں ۔ (مسکر اکر) اسی لئے تو مرد اس کی بارگاہ میں جبہیں سائی کے لئے مجبور ہو گیا ہے ۔

عابدہ ۔ (مسکر اکر) سبحان اللہ! یہ جذبۂ جبہیں سائی شرک کی ناپاکیوں سے طہارت کا محتاج ہے ۔

اختر۔ (مسکرا کر) سبحان اللہ! سبحان اللہ!

نائیدہ۔ بات یہ ہے کہ مرد کے اندر ہوا و ہوس نے گہرا نقش جما
رکھا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ عورت کو اس کی نز...
سے دور کیا جائے تاکہ اس کی جسمانی لذتوں کے سا...
کم ہوں اور اسے سخت کوشی کی طرف مائل کیا جاسکے۔

اختر۔ ماشا اللہ! تم نے پھر شرک، وحدانیت، طہارت او...
ناپاکی کی بحث چھیڑ دی۔ تمہارے دل و دماغ پر بس...
یہی ایک جنون مسلّط ہے۔ مرد اس کے سوا اور کچھ نہیں
چاہتا کہ عورت اپنے وجود کا صحیح مصرف سمجھے۔ اگر زند...
عورت ہی کے اشاروں پر رقص کر رہی ہے تو مرد...
چاہتا ہے کہ یہ جمالِ دائم افروز زندگی کے رقص ...
مرد کا ساتھ دے۔

نائیدہ۔ (مسکراتی ہے) اگر آپ کا مقصد آپ کے کذب زا...
رقص سے ہے تو میں آگے کچھ عرض کرنے کی جرأت...
کر سکتی۔ (اختر مسکراتا ہے) بات یہ ہے کہ مرد کی...
مسموم ذہنیت جو عورت کو رقص کے لئے ابھار رہی...
عورت کے حسن کے خاتمے کا سبب بنی ہوئی ہے۔...
چہرہ جو آنکھوں پر اپنے حسن صورت میں حوران...
کو شرمانے کی فکر میں لگا ہوا ہے، اپنے فطری حسن کو...

کر کے مصنوعی جمال عالم فریب کے خیال کا شکار ہے۔ لیکن پاکیزہ سرشت منافق چہروں سے نفرت کرتی ہے اور وہ رعنائی جو پاکیزگی فطرت کے خالص جمال کی تجلیوں سے دو عالم کو خیرہ کر رہی ہے زندگی کی رونق ہے اور نفس مطمئنہ کو آب زلال سے نواز رہی ہے۔ یہ پر تو حسن کسی بارگاہ ہمہ جمالی کا بخشا ہوا ہے۔ عورت کی سرشت میں قدرت نے عفت و عصمت کی کیسی بیش بہا دولت رکھی ہے! اس کی فطرت کی لطافت کسی لطیف کی عطا کردہ ہے۔ صفات جمالی کی امانت، اللہ کی اس خوش بخت مخلوق کی قسمت میں آئی ہے۔ جمال لاجواب کا مظہر یہیں نظر آتا ہے۔ دنیا سے واسطہ ہے، ملائک سے رشتہ ہے، سبوح قدوس کے نغمے یہیں گونج رہے ہیں، سبحان ربی الاعلیٰ کی صدائیں یہیں بلند ہو رہی ہیں، یا لطیف یا لطیف کے ترانے یہیں گائے جا رہے ہیں، کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی فطرت، روح و ریحان کے جھونکوں سے معطر ایک عالم کے لئے عطر بیزی کا سامان کر رہی ہے۔ زندگی کی بخشش کا مقام یہی ہے پاکیزہ کلیاں یہیں سے نمو کرتی ہیں، ابھرتی ہیں اور پھلتی پھولتی ہیں۔ یہی گود احسن تقویم کی تربیت گاہ ہے، یہی آغوش زندگی کا گہوارہ ہے،

رنگ و بو میں یہیں روح پھونکی گئی ہے۔ اللہ کی شان ہے "کن فیکان" کا مقام ہے۔ عیسیٰ دم آدم اپنی تخلیق میں اسی ایک مقام کا محتاج ہے۔ تخلیق کی نبض میں حرکت اسی کے دم سے ہے۔ اللہ کی دین ہے، کائنات کی جان ہے، زندگی کا حاصل ہے، ربوبیت کا مظہر ہے۔ پروردگار کا تماشا دیکھنا ہو تو دیکھ لو۔ اس کے جلال کے آگے دنیا کو سہم جانا چاہیئے۔ دم بخود رہنے کا مقام ہے اس کے حضور میں اُف کی آواز بھی گناہ عظیم ہے کہ یہ بڑی بارگاہ ہے۔ جنّت اس کے قدموں میں ہے۔ دوزخ اس کے لطف سے بجھی جا رہی ہے۔

(عابدہ کی آنکھوں کی چمک اس کی داخلی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی روشن پیشانی پر عورت کی عظمت کے آثار رقص کرنے لگتے ہیں۔)

اختر۔ (مسکراتے ہوئے عابدہ کی طرف دیکھتا ہے۔) سبحان اللہ! تو یہ فرمایئے کہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

عابدہ۔ (سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ) جی نہیں، فرشتہ نہیں انسان ہے کہ اس کے جمال کے آگے فرشتے بھی سربسجود ہیں۔

اختر۔ اللہ اکبر! (مسکراتا ہے) تو اس جنّت نظارہ کو دنیا کی نظروں سے دور نہ رہنا چاہیئے۔ اس کے کمال کا آشکا

کرنا بھی ضروری ہے۔

عابدہ۔ یا اللہ! میں آپ سے اس سے بہتر جواب کی توقع رکھتی تھی۔

اختر۔ یہ لیجئے! تو گویا آپ کی توقعات کا سارا بوجھ میرے ہی دوش پر رہا۔ حق تو یہ ہے کہ اس دردسری کے بعد میں تم سے بہتر نتائج کی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے نا امیدی ہوتی ہے کہ زندگی کی غیر حقیقی قدروں پر تمھارا ایمان جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے۔

عابدہ۔ الٰہی توبہ! تعجّب تو یہ ہے کہ آپ نے انہیں غیر حقیقی کیونکر سمجھ لیا۔ حقیقت میں یہی قدریں سرمدی حیات کی ضامن ہیں، اور زندگی انہیں کے لئے تڑپ رہی ہے۔

اختر۔ تم نے انسان کے نفسیاتی حقائق کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

عابدہ۔ جی نہیں، میں نے نفسیاتی حقائق کو طاقِ نسیاں سے نکال کر محفلِ خیال میں بٹھانے کی کوشش کی ہے تاکہ شعور کی آنکھ انہیں احساس کی نظر سے دیکھے۔

اختر۔ نہیں، بلکہ تم نے زندگی کے تقاضوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل تمہاری منطق ایک نئی دنیا کا مطالبہ کر رہی ہے۔

عابدہ۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ انسان کی نظر زندگی کو بے نقاب دیکھے۔ البتہ میں نے

ایک نئی دنیا کا مطالبہ ضرور کیا ہے۔ ایسی دنیا جس میں مرد عورت کی عظمت کو پامال نہ کرے۔ بہیمیت کی آندھیوں نے جو گندگیوں کے طوفان برپا کر رکھے ہیں انھیں نابود کر دیا جائے۔ تخلیق کے رگ و ریشے میں جو ناپاکیاں لپٹی جا رہی ہیں انہیں پھینک دیا جائے۔ ایسی دنیا جہاں عورت کی قلمرو میں مرد کو دخل نہ ہو۔

اختر۔ (مسکراتا ہے) تو گویا آپ عورت کے لئے درجۂ نوآبادیات چاہتی ہیں؟

عابدہ۔ (مسکرا کر) اے لو! حکمران طبقہ اس طرح کی باتوں میں بہلانا خوب جانتا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اب درجۂ نوآبادیات کا زمانہ نہیں رہا۔

اختر۔ تو گویا عورت کامل آزادی چاہتی ہے (مسکرا کر) مرد اس کے لئے بھی بخوشی تیار ہے۔

عابدہ۔ شاید میں اپنا مطلب واضح طور پر بیان نہ کر سکی۔ بس

اختر۔ میں تمھارا مطلب خوب سمجھا۔ تم نے صرف زندگی کے نقد کی خاطر اس مسئلے کے دوسرے رخ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جس میں انسان کی صلاح و فلاح کا بڑا سامان ہے۔

عابدہ۔ جی نہیں۔ قطع نظر اس کی تفصیلات کے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مسئلے کے ہر دو پہلوؤں میں خیر و شر کا کتنا حصہ ہے۔

اختر۔ (گھڑی پر نظر کرکے کچھ بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔) اس بدنصیب عورت نے دوسرے پہلو کے خیر کو مان بھی لیا تو اس میں شر کی مقدار کو بڑھا کر (چہرے کو رومال سے صاف کرتے ہوئے) ظاہر ہے کہ جب زندگی کی قدریں ہر دو کی نظر میں ایک سی نہیں ہیں تو ان کے نتائج کا نزاعی ہونا بھی ضروری ہے۔

عابدہ۔ (اختر کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے) کاش کہ ایسا نہ ہوتا۔

اختر۔ اس کاش میں بہت کچھ آجاتا ہے۔ لیکن حقیقت زندگی کی یہی ہے کہ عورت کو مرد کا ساتھ دینا پڑے گا۔

عابدہ۔ لیکن ساتھ دینے کا مطلب یہ کیوں لیا جائے کہ اسی غریب کی تراش و خراش عمل میں لائی جائے۔

اختر۔ اس لئے کہ وہ ناقص العقل ہے۔

عابدہ۔ خوب خوب! جس جگہ مرد کا شعور حیران رہ جاتا ہے اس گتھی کو عورت کی عقل ہی سلجھا سکتی ہے۔ لیکن اس بنا پر عورت نے مرد کو کبھی ناقص العقل نہیں کہا۔ اور اسی لئے یہاں عورت کو ناقص العقلی کا الزام دینا بھی بیجا ہے۔ قدرت نے ہر دو کو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں کامل عقل عطا کی ہے۔

اختر۔ قربان جایئے آپ کی اس عقل و فراست کے ہم ......

عابدہ۔ (بات کاٹ کر) ہاں، آپ یہ ضرور فرما سکتے ہیں کہ چند

مصالح کی بنا پر مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ جہاں زندگی کی جد وجہد کے لئے عورت کی تربیت نے مرد کو میدان عمل میں پیش کیا ہے، وہاں مرد کا یہ فریضہ بھی ہے کہ عورت کے گرد ایک ایسے آہنی حلقے کی پاسبانی کرے جو عورت کو اپنے مقدس فریضے کی انجام دہی میں منہمک اور بیرونی اثرات کی خلل اندازی سے مصئون و مامون رکھے، تاکہ اس کا جوہر بے داغ رہے۔

اختر۔ (گھڑی کی طرف دیکھ کر استہزا آمیز لہجے میں) تمہاری لن ترانی کبھی ختم بھی ہوگی؟ کچھ نہیں تو رفع شر کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے تمہارے اعتقادات کے خلوص کو تسلیم کئے لیتا ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ حقیقت وہی ہے جسے میری نظر دیکھ رہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی میرا عقیدہ یہ ہے کہ حقیقت کو یونہی ہونا چاہیئے؟ اس لئے کہ زمانہ اور اس کی ضروریات اسی کی داعی ہیں۔

عابدہ۔ صحیح، لیکن زمانہ سازی بھی اعلیٰ نفوس کا دستور نہیں ہونا چاہیئے۔

اختر۔ اب تک تو زمانے کا یہی دستور چلا آیا ہے۔

عابدہ۔ اسی لئے تو اس دستور کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

اختر۔ جی ہاں، سب سے پہلے تو تمہیں خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

زمانہ تمھاری نظروں سے فریب کے پردے جلد اٹھا دے گا اور دنیا عورت کو اسی مقام پر پائے گی جہاں مرد اس کو رکھنا چاہے گا۔

عابدہ۔ آپ کا یہ خیال اس بنا پر ہے کہ مرد کی نگاہ عورت کے ظاہری نرم و نازک جسم میں الجھ کر رہ گئی ہے اور اپنی اس غلط بینی میں وہ اس کے باطن تک نہ پہنچ سکی۔ اس کا باطن اس کے ظاہر سے مختلف ہے۔

اختر۔ یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔

عابدہ۔ آپ اسے خوش فہمی ہی کہہ لیجیے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورت کے جذبات کی لطافت اور اس کی بے پایاں رافت و رحمت کی مخلصانہ وابستگیوں کے باوجود اس کے عزائم غیر متزلزل ہیں۔ عورت کے ضمیر کی صدائیں مرد کے استبداد کے نیچے دب کر نہ رہ جائیں گی۔

اختر۔ (لہجے کو سخت اور آواز کو بلند کر کے) تو اس مبارک عزم کو آزمانا چاہیے۔

(عابدہ کی پیشانی پر ہلکے ہلکے خطوط بن کر غائب ہو جاتے ہیں اور اس کے ابرؤں میں جنبش پیدا ہوتی ہے۔ وہ خاموش ہو جاتی ہے۔)

"مجلس چہارم"

منظر اول

(تیسری مجلس کے پہلے منظر اور اس منظر کے درمیان تقریباً چار سال کا وقفہ ہے جس میں اختر کی زندگی حسب معمول گوناگوں ناہمواریوں کا شکار رہی۔ یہاں سے اس خستہ حالی کا دور شروع ہوتا ہے جس کی اصلاح کی تدبیر عقل کو حیران کر دیتی ہے۔ پراگندہ دل پراگندہ دماغ عقل و شعور کے ساتھ صحت بھی کھو بیٹھتا ہے۔

اختر کے مکان کا ایک کمرہ جس میں کرسیاں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی گول تپائی پر سگار کا ڈبا رکھا ہے۔ اختر اور عابدہ کرسیوں پر بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی ٹپکتی ہے۔)

اختر۔ (سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے) وہ زندگی جو احساس سے بیگانہ ہے، جسے بلندی اور پستی کا شعور نہیں رہا، عزت اور ذلت میں تمیز باقی نہیں رہی، جو حوادثات کے حوالے

ہیں بے بسی اور مجبوری کو لئے ہوئے ہی جا رہی ہے جس
نے موت کی فتحمندی کو تسلیم اور نکبت کو قبول کر لیا ہے
وہی وجہ ہے کہ ان زلزلوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے نفس
غیور کے لئے ایسی زندگی لعنت ہے۔

عابدہ۔ لیکن نفس غیور مادی جاہ و ثروت سے حمیّت و غیرت
کی صفت اجاگر نہیں کرتا۔ بلکہ اسباب کے طلسمی پردوں
کو چاک کر کے زمانے پر حکمرانی کرتا ہے۔

اختر۔ (بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) تم نے گفتگو کو پھر مطلب سے
دور لیجا کر پھینک دیا۔

عابدہ۔ جی نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے
کے بجائے ہم اپنے وسائل کا جائزہ لیں، اور زندگی کو
سادہ اور نئی بنیادوں پر قائم کریں۔ یہی ایک صورت
اصلاح کی میری سمجھ میں آئی ہے۔

اختر۔ تم نے حالات کی نزاکت کا اندازہ نہیں کیا۔

عابدہ۔ میں اس کا اندازہ خوب کر چکی ہوں۔ یہی نا کہ ہمیں
اس شان و شوکت کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔
اچھا ہے شاید یہی افلاس کی تلخیاں ہماری زندگی میں
اصلاح کی صورت پیدا کر سکیں۔

اختر۔ افلاس خود ایسی لعنت ہے جس میں اصلاح کی صلاحیتیں

معدوم ہو جاتی ہیں۔

عابدہ۔ یہ صحیح ہے، لیکن تونگری تو اس سے بڑی لعنت ثابت ہو رہی ہے۔

اختر۔ (عتاب آمیز لہجے میں) تم لایعنی باتوں کو چھوڑو اور میرے سوال کا جواب دو۔

عابدہ۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتی۔ میری غیرت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔

اختر۔ میاں محمود کی غیرت اور حمیّت نے یہ گوارا کر لیا کہ غیر کی دولت پر ہاتھ صاف کریں۔ اور تمہاری غیرت اور حمیت کو اپنا حق طلب کرنے میں شرم دامنگیر ہے؟

عابدہ۔ یا اللہ! غور کرنے کا مقام ہے کہ ابّا مرحوم نے محمود بھائی کو اپنی زندگی میں جو کچھ دے دیا اب مجھے اس کی واپسی کے مطالبے کا حق کیونکر پہنچتا ہے؟

اختر۔ اس لئے کہ وہ دولت وراثتاً تمہیں ملنی چاہیئے تھی۔

عابدہ۔ یہ صحیح ہے۔ گو اس میں پھوپھی جان کا بھی حصہ ہے لیکن وراثت کا سوال زندگی میں پیدا نہیں ہوتا اور مورث کی وفات کے بعد زندگی کے کاروبار پر اعتراض کا حق وارث کو نہیں پہنچتا۔ یہ جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اختر۔ میری بھی تو سنو۔ اس میں قانونی شقیں ایسی ہیں کہ ہم

ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

عابدہ۔ قانونی شقوں سے فائدہ اٹھانا میں انصاف سے بعید سمجھتی ہوں۔ مرحوم کے منشا کو جان کر میں یہ کیونکر کر سکتی ہوں؟

اختر۔ (غصہ ہو کر) تم اس منصف مزاجی کے زعم میں زندگی کی تباہی مول لے رہی ہو۔

عابدہ۔ جی نہیں۔ یہ زندگی کی تباہی نہیں ہے۔ اسباب عیش سے محرومی ایسی مصیبت تو نہیں ہے جو زندگی کو وبال جان بنا دے۔

اختر۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ میرا وقار ایک عبرتناک رسوائی کا شکار ہو رہا ہے۔

عابدہ۔ معاف کیجئے گا، اگر میں یہ عرض کروں کہ کم و بیش یہی صورت اس سے پہلے بھی پیش آچکی ہے جس سے گلو خلاصی کے لئے میں نے سب کچھ نذر کر دیا۔ کورٹ آف وارڈس کی رقم کے غبن کا معاملہ آپ کے عزیز دوست کے کردار کا آئینہ دار ہے لیکن اس کے بعد بھی آپ اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہزاروں کی قربانی کے بعد پھر وہی صورت پیش ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اب وقار اور رسوائی کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔ اور تحمل کو خیرباد کہنے

ہوئے کسی چھوٹے مکان میں منتقل ہو جانا چاہیئے۔ ہماری زندگی کا یہ ایک نیا دور ہوگا جس میں دولت کے کتّے ہمارے گرد و پیش نظر نہ آسکیں گے۔ مجھے یہی زندگی محبوب ہے۔ اور میں اسی دن کی منتظر ہوں۔

اختر۔ اس لئے کہ تم نے گرد و پیش کے حالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔

عابدہ۔ مجھے خوب اندازہ ہے۔ لیکن میں اس بدلتی ہوئی دنیا کو کسی اور نظر سے دیکھتی ہوں۔

اختر۔ (برہم ہوکر) تمہیں کوئی نظر بھی حاصل ہے؟......
(عابدہ خاموش ہو جاتی ہے) میں اب بھی یہی کہونگا کہ ہمارے درد کی دوا خود تمہارے پاس ہے' اگر تم چارہ جوئی کے لئے تیار ہو جاؤ۔

عابدہ۔ میں اس کے لئے بسر و چشم تیار ہوں' اور مجھے یقین ہے کہ میری پیش کردہ تجویز ہماری زندگی کی اصلاح کی اب بھی ضامن ہو سکتی ہے۔

اختر۔ (بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) لاحول ولا قوۃ' تم نے تو بس ایک ہی راگ الاپنا سیکھا ہے۔

عابدہ۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں پچاس ہزار روپے محمود بھائی سے چھین کر ڈاکٹر کے حوالے کر دوں؟ مجھے اس کا حق

بھی تو نہیں پہنچتا۔

اختر۔ (چہرے سے غیظ وغضب ٹپکتا ہے) تمہارے ان خیالات کی بنیاد کو اس منطقی بیان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

عابدہ۔ یا اللہ! میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتی ہوں۔

اختر۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے زندگی کے طوفان میں گھر کر تباہ حال دیکھنا چاہتی ہو۔ میں تمہارے رجحانات کو خوب پہچانتا ہوں۔ تمہاری پھوپھی اب بھی تمہاری غمگساری کرتی ہے۔ (عابدہ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ خاموش ہو جاتی ہے)۔ تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟

عابدہ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اب میں کیا جواب دوں! اگر آپ اصلاح حال کی خاطر میری روح بھی سلب کرنا چاہیں تو بخوشی کر سکتے ہیں۔ میں اتنی قربانی بھی کم سمجھتی ہوں۔ کاش! میں اسی طور پر کچھ کرنے کے قابل ہوتی۔

اختر۔ تمہاری یہ گفتگو عورت کے مکر و فریب کو ظاہر کرتی ہے۔

عابدہ۔ میری بد نصیبی ہے کہ میں اپنے خلوص کے نقوش آپ کے دل پر نہ چھوڑ سکی۔

اختر۔ بلکہ تم نے اپنی بد طینتی سے مجھے ہمیشہ مشتعل رکھا ہے۔

عابدہ۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ میں آپ سے اس بد طینتی کے خیال کو دور کرنے کے لئے ہمیشہ دست بہ دعا رہی ہوں۔ لیکن

میری بدبختی نے میری دعاؤں کو مستجاب نہ ہونے دیا۔

اختر۔ اگر تم اصلاح حال چاہتی ہو تو سمجھو کہ بس یہی تمہارا امتحان تھے

عابدہ ۔ (عابدہ کے چہرے سے اس کا داخلی ہیجان ظاہر ہوتا ہے) یا اللہ! یا اللہ!
زندگی کی مجبوریاں انسان کو کن بلندیوں سے گرا دیتی
ہیں۔ کاشکے آپ مجھے اس قدر مجبور نہ کرتے۔

اختر۔ تم اسے مجبوری کا نام دے رہی ہو؟

عابدہ ۔ انسان کو اپنے ضمیر پر اختیار نہیں ہوتا۔

اختر۔ (استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) کیا عورت کے سینے میں
ضمیر بھی ہوتا ہے؟

عابدہ ۔ (پریشان ہوکر) میرے ہوش بھی تو بجا نہیں ہیں۔

اختر۔ ہوش و حواس کس بدبخت کے بجا ہیں؟ زندگی کا اب
سہارا ہی کیا باقی رہ گیا ہے جو زندگی کو استقامت بخشے؟

عابدہ ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) سہاروں کی کمی نہیں۔ کاشکے ہم
ان سے کام لینا جانتے۔

اختر۔ تم زندگی کے اس انقلاب کو خوش آمدید کہہ کر سہارا ڈھونڈ
رہی ہو۔ تمہاری اسی غلط بینی نے یہ بدبختی مسلط کر رکھی ہے۔

عابدہ ۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ ہم وقتی طور پر اسباب کے سہارے
سے گلو خلاصی کر کے بھی انجام کار اس بدبختی سے بچ نہیں
سکتے۔ ضرورت صرف اس قدر ہے کہ ہم زندگی کے رخ کو

بدل کر اپنے اندر ایک نئی نظر پیدا کریں۔

اختر۔ تم نے فقط وعظ و نصیحت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ عورت کا دل رکھنے کے باوجود زندگی کی تباہی کو دیکھ کر تمہاری آنکھوں سے دو آنسو نہ بہہ سکے، چارہ جوئی کی تدبیر کے لئے تم دو قدم بھی آگے نہ بڑھ سکیں۔

(اختر جیب سے کاغذ نکال کر عابدہ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔
عابدہ کاغذ اٹھا کر پڑھتی ہے اس کے چہرے سے غیر معمولی پریشانی ٹپکتی ہے۔)

عابدہ۔ تو یہ صورت ہے؟

اختر۔ (عابدہ کی طرف دیکھ کر) تمہیں بھی تو اسی کا انتظار تھا۔

عابدہ۔ (اختر کی طرف دیکھ کر) میں نہ کہتی تھی کہ یہ غبن کا معاملہ ہزاروں کی قربانی کے بعد بھی نہ دب سکے گا۔ اور ابھی کیا معلوم کہ اس ڈاکٹر نے کن کن مقامات پر نقب زنی کی ہے۔

(عابدہ کاغذ میز پر رکھ دیتی ہے۔ خادمہ داخل ہوتی ہے۔)

خادمہ۔ (اختر سے) ڈاکٹر صاحب ملنا چاہتے ہیں۔

اختر۔ (خادمہ سے) اندر کھینچ دو۔

(خادمہ چلی جاتی ہے۔ اختر غضبناک نظروں سے عابدہ کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔ ڈاکٹر عزیز داخل ہوتا ہے۔

وہ اختر کے پریشان چہرے کا جائزہ لیتا ہے)

عزیز ۔ (مسکرا کر) آداب عرض ہے ۔ (وہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

اختر ۔ ڈاکٹر تم نے میرے خون کا آخری قطرہ بھی نہ چھوڑا ۔ تم نے میری روح سلب بھی کی تو اس بے دردی سے اس زندگی کے خاتمے کے لئے اتنی بے دردی کی ضرورت نہ تھی

عزیز ۔ میں نہیں جانتا کہ آخر یہ برہمی کیوں ۔

اختر ۔ تم سب کچھ جان کر بھی انجان بنتے ہو ۔

عزیز ۔ (چہرے سے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے) یہ لیجئے اب مجھے اس سے کیا مطلب ؟

اختر ۔ تم سے زیادہ اور کسی کو اس سے مطلب نہیں ہے ۔

عزیز ۔ اگر تم دیوانے ہو گئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں ؟

اختر ۔ (آواز کو بلند کر کے عتاب آمیز لہجے میں) ہاں ، میں دیوانہ ہوتا جا رہا ہوں ۔ اگر اللہ ہے تو بس وہی جانتا ہے کہ اس میں میرا کتنا حصہ ہے ۔

عزیز ۔ (حقارت آمیز لہجے میں) اللہ کچھ نہیں جانتا ، تم اور میں اسے بخوبی جانتے ہیں ۔ دفتر کی بے ایمانی کو روکنا تمہارا کام تھا یا میرا ؟ اور معاف کیجئے گا قبلہ اختر صاحب! آپ معاوضہ بھی تو اسی کا پاتے رہے ہیں فقط اعزازی خدمت کا گناہ گار ہوں ۔ میری بدبختی ہے کہ بھلائی کا بدلہ برائی

میں دیکھ رہا ہوں۔

اختر۔ بھلائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی ہی ہوا کرتا ہے۔

عزیز۔ (طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) تو پھر آپ کی یہ بدبختی کس کے حساب میں لکھی جائے؟

اختر۔ یہ سب میرے حساب میں لکھی جائے۔

عزیز۔ ابھی تو آپ بھلمنسی کے دعویدار تھے!

اختر۔ تم غلط کہتے ہو، میں نے اس کا کبھی دعوی نہیں کیا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ میں اپنی زندگی میں خیر و شر کی آمیزش کا مجرم رہا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر معاف کرنا میں نے تمہیں شر محض پایا۔

عزیز۔ (تلخ مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے) اگر تمہیں اس کا تجربہ اب ہوا ہے تو تم نے اس میں بڑی دیر کر دی۔

اختر۔ اس کا مجھے بھی افسوس ہے ... نہیں، اب تو افسوس بھی باقی نہیں رہا۔

عزیز۔ یہ آپ کی مجبوری ہے۔ اسی لئے میں آپ کی تلخ نوائی برداشت کرنے تیار ہوں۔

اختر۔ تم نے مجھے مجبور کہا ہے۔ یقیناً میں مجبور ہوں، انتہائی مجبور۔ (اس کے چہرے پر غم و غصے کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں) لیکن تم میرے سامنے یہ اقرار کرو کہ تم نے اپنے

اپنے دوست اختر کو زندہ دفن کر دیا۔ اس لئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ اچھا دوست تھا۔ تم میرے سامنے اس کا اعتراف کر دو تاکہ میں اپنی دیانتداری کے احساس کو لے کر دنیا سے رخصت ہو سکوں۔ میں تمہاری ان ستم انگیز نوازشوں کے ہر تلخ نتیجے کو برداشت کرنے تیار ہوں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ دنیا دی قانون تمہیں میرے بیان کی زنجیروں سے جکڑ سکتا ہے تو اطمینان رکھو کہ اختر اس تلخ ساعت سے پہلے اس قید و بند سے آزاد ہو چکیگا۔

عزیز۔ میں حیران ہوں کہ آپ کیا بک رہے ہیں۔

اختر۔ تم مجھے دیوانہ سمجھتے ہو؟

(اختر خاموش ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز کرسی سے اٹھتا ہے)

عزیز۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ پہلے آپ اپنی طبیعت میں سکون پیدا کیجئے۔

اختر۔ اب سکون کی بات کرتے ہو؟

عزیز۔ اچھا!

(عبدالعزیز چلا جاتا ہے)

منظر دوم

[ڈاکٹر عزیز کے دواخانہ کا وہی چھوٹا کمرہ۔ عزیز اور اختر کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اختر کے چہرے سے طبیعت کا اضمحلال پایا جاتا ہے اور پریشانی ٹپکتی ہے۔]

اختر۔ یہ آپ کی تشخیص میری سمجھ میں نہ آئی۔

عزیز۔ اب آپ جو چاہیں سمجھ بیٹھیں۔ گویا آپ ڈاکٹر کی تشخیص پر جرح فرمانے لگے۔ آپ اپنی جلد کی حالت پر نظر نہیں کرتے؟

اختر۔ (مایوسانہ انداز میں) تو شاید یہ میری تمنا ہے جو یوں اظہار کی راہ ڈھونڈ رہی ہے۔

عزیز۔ لیکن لایعنی تمنائیں بے سود ہوا کرتی ہیں۔

اختر۔ بے سود سہی، تھوڑی دیر کے لئے تسلّی کا سامان تو کر دیتی ہیں۔

عزیز۔ یہ تسلّی بھی بے نتیجہ ہے۔

اختر۔ تو اسی لئے آپ نے میری زندگی کو ایک طوفان کے حوالے کر دیا؟ آپ رینگتی ہوئی زندگیوں کو باقی رکھنے کے قائل بھی تو نہیں ہیں۔

عزیز۔ (اختر کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے) توبہ، یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟

آپ کی دانست میں میں نے اس کا اظہار کر کے بڑا گناہ کیا ہے؟

اختر۔ بیشک ایسا گناہ جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کی المناک حقیقت پر فراموشی کے پردے ڈال کر انسان بڑی بڑی مصیبتوں سے گذر جاتا ہے۔ اب آپ نے میری زندگی کے لئے کونسا مقام چھوڑا ہے؟ (اس کے چہرے پر اندرونی خلفشار اور درد و کرب کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔

وہ ایک سرد آہ بھرتا ہے۔)

عزیز۔ یہ آپ نے کیا کہدیا؟

اختر۔ یقیناً اب زندگی میں باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔ آپ ہی فرمائیں کہ اس طور پر زندگی کیونکر بسر ہو گی۔ نفرت خیز، نفرت انگیز، سڑی گلی زندگی کو لیکر میں کیونکر جیونگا؟

عزیز۔ لیکن ساری دنیا تو بس اسی ایک جینے پر مر رہی ہے، پھر زندگی جس طور کی بھی ہو۔

اختر۔ یہی فریفتگی زندگی کو وبال جان بنا دیتی ہے۔

عزیز۔ زندگی کو اس نظر سے دیکھنے کا کون عادی ہے؟

اختر۔ جنہیں زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔

عزیز۔ ایسے نفوس عنقا ہیں۔ زندگی ہر حال محبوب ہے۔

اختر۔ زندگی کے مآل کا احساس زندگی کی محبوبیت کو ختم کر دیتا ہے۔

اور انسان ایک ایسی فراموشی کو ترستا ہے جس میں پھر بیداری کو دخل نہ رہے۔

عزیز۔ اب آپ جنون کی باتیں کرنے لگے۔

اختر۔ لیکن یہ جنون پیدا کرنے والے بھی تو آپ ہی ہیں۔

عزیز۔ (تیوری چڑھا کر) میں؟

اختر۔ جی ہاں، آپ اور فقط آپ۔ حقیقت میں زندگی کی ساری تلخیوں کے لیئے میں آپ ہی کا مرہون منت ہوں۔ آپ کی کارگذاریاں روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ یہ ڈاکٹر مہاجن بھی بن جائیگا۔ وہ آپ ہی ہیں کہ میرے رہنے کے لئے مکان تک نہ چھوڑا۔ اب تو گذر بسر کے بھی لالے پڑے ہیں۔

عزیز۔ بھائی برہم ہونے کا مقام نہیں ہے۔ سچ بات کڑوی ضرور ہوتی ہے لیکن مجبوراً کہنی پڑتی ہے۔ معاف فرمائیں میں نے آپ سے نوابی کرنے کو تو نہیں کہا تھا۔ کیا یہ مہ جبینوں سے دل لگانا بھی میرے ہی حساب میں ہے؟ رقص و سرود اور قماربازی کی محفلوں میں آپ کا جو مقام رہا ہے وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ میرا یہ جرم ضرور ہے کہ میں آپ کے عیش کا سامان کرنے میں آپ کا ادنیٰ خادم بنا رہا۔

اختر۔ (چہرے سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) آپ صحیح فرماتے

ہیں۔ اب مجھے الزام دینے کا حق بھی تو نہیں رہا۔

عزیز۔ اور حیرت ہے کہ آپ گذر بسر کی پریشانی کو رو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مال و زر کی خدائی آپ کے پہلو میں ہے اور آپ افلاس کی آگ میں جل رہے ہیں۔

اختر۔ (برافروختہ ہوکر) اس خدائی پر لعنت اور ساتھ ہی تم پر بھی۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

عزیز۔ (سکوت کو توڑتے ہوئے) مجھے آپ کی زندگی پر حیرت ہے۔

اختر۔ مجھے اس سے زیادہ حیرت ہے۔ (وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے)

عزیز۔ (مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ) تشریف تو رکھیے، آپ اس قدر حواس باختہ کیوں ہیں؟

اختر۔ (بیٹھ جاتا ہے) اب حواس بجا رکھنے کا مطالبہ کرتے ہو؟

عزیز۔ (مسکرا کر) تم چاہو تو اس ڈاکٹر سے معجزے طلب کر سکتے ہو، بشرطیکہ اس کی ہدایت کو اب بھی رہنما بناؤ۔

اختر۔ ڈاکٹر، تم فقط مرض پیدا کرنا جانتے ہو، اس کا علاج تمہارے بس میں نہیں ہے۔

عزیز۔ یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو؟

اختر۔ اب تم اسے جو چاہو سمجھو۔

عزیز۔ تمہاری زندگی استقلال کی راہ سے گریزاں ہے۔

اختر۔ بلکہ یہ کہو کہ خود زندگی کی راہ سے گریزاں ہے۔

عزیز۔ یہ آپ کے حوصلوں کی پستی ہے۔

اختر۔ مجھے تسلیم ہے۔ یہ شعر یاد رکھنا کہ کبھی اختر سے سنا تھا۔

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

(اختر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

عزیز۔ (اپنی جگہ سے اٹھ کر اختر سے ہاتھ ملاتا ہے) تو آپ آج دو بجے منتظر رہیگا۔

اختر۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ مجھے انتظار کا دماغ ہے نہ ملاقات کی تاب۔ میرے کانوں میں عجیب عجیب آوازیں آرہی ہیں، میرے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہو رہے ہیں، ایک طوفان میرے دل و دماغ میں برپا ہے۔ میں کب تک اپنی طبیعت کو سنبھالتا رہوں گا! میرا وجود ایک انقلاب کو ترس رہا ہے۔ (آواز کو بلند کرکے) تخریب، تخریب، تخریب۔ ایک انہدام، ایک شکست، ایک فراموشی —— (اختر کے چہرے سے وحشت ٹپکتی ہے۔ عزیز خاموش نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ کمرے سے نکل جاتا ہے۔)

منظر سوم

[روزنامہ نسیم حجاز کا دفتر۔ کمرے میں دیوار سے لگی ہوئی چند الماریاں ہیں جن میں کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ اس دیوار میں ایک کھڑکی ہے جو سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ کھڑکی سے کچھ ہٹ کر ایک میز ہے جس کے دو طرف دو خوبصورت تپائیوں پر کاغذات اور مثلیں رکھی ہیں۔ میز کی ایک طرف ایک کرسی پر محمود بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے دوسری کرسی پر الطاف ہے۔ بائیں طرف ایک دروازہ ہے جس میں پردہ پڑا ہوا ہے۔]

الطاف۔ (گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے) آپ کے کل کے اداریے کی بڑی شہرت ہے۔ (مسکراکر) اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

محمود۔ (مسکراتا ہے) بھائی صاحب، شہرت کی نہ کہیئے۔ اس کے لئے زیادہ لیاقت کی ضرورت نہیں، البتہ زمانے کو خلوص کی محتاجی ہے۔ خیر تو میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ اختر صاحب کے لئے بہر صورت کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔

الطاف۔ آپ کے جذبات قابلِ احترام ضرور ہیں، لیکن آپ کن کن مصیبتوں کو دفع کیجئیگا؟ کورٹ اوف وارڈس کے غبن کا ایک نیا معاملہ جو کھڑا ہو گیا ہے۔

محمود۔ اس قصے کو ابھی منظرِ عام پر آنا ہے۔ شاید آپ کو اس کا علم نہیں کہ اس میں ایک اختر ہی ماخوذ نہیں ہیں بلکہ ڈاکٹر کی گردن بھی بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ سچ ہے کہ دولت کی طمع میں انسان اندھا بن جاتا ہے۔

الطاف۔ یہ آپ کو کیونکر معلوم ہو گیا؟

محمود۔ منشی منیر کا خدا بھلا کرے بڑا کام کا آدمی ثابت ہوا۔

الطاف۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر کا جادو اب تک اختر پر چل رہا ہے۔

محمود۔ یہ صورت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی مصیبت اکثر اصلاحِ حال کا سبب بن جاتی ہے۔

الطاف۔ اور اصلاح کی تمام راہیں مسدود بھی کر دیتی ہے۔ انسان پریشانیوں میں گھر کر اخلاق کھو بیٹھتا ہے۔

محمود۔ (الطاف کی طرف غور سے دیکھ کر) یہ آپ کیوں آج بے تعلقی کی باتیں کر رہے ہیں؟

الطاف۔ اس لئے کہ مجھے تکلیف ہے، زبردست روحانی کوفت۔ میں نے اختر کے لئے کیا کیا نہیں کیا۔ عابدہ کو مصیبت میں گرفتار کرنے کا گناہ بھی ایک انہیں کی خاطر مول لیا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ عابدہ سے تمہارا رشتہ طے شدہ امر تھا، اور یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ میں نے اختر کی

ہمدردی ہیں تم سے دشمنی کی اور بالآخر ایک ایسے جرم کا مرتکب ہو جس کی تلافی اب ممکن نہیں۔ میں آج تم سے معذرت خواہ ہوں۔

محمود۔ (تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) بھائی صاحب، یہ سب مقدرات کی باتیں ہیں۔ آپ نے پرانی داستان دھرا کر مجھے تکلیف پہنچائی۔ اس میں معذرت کی بات ہی کیا ہے۔ اس قصے کو بھلا دینا ہی بہتر ہے۔

الطاف۔ تم لاکھ خاموش رہو، مجھ سے کونسی بات چھپی ہوئی ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ تم سا حوصلہ مند انسان دنیا میں مشکل سے ملتا ہے۔

محمود۔ یہ آپ کی نوازش ہے اور میں آپ کا ممنون ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو زیادہ پہچانتا ہے۔ آپ کا خیال اس حد تک صحیح ہے کہ عابدہ کی زندگی کو سنوارنے کا میں آرزو مند رہا۔ مقدر کو کچھ اور منظور تھا۔ بہر حال شکر ہے کہ زمانے نے ہزار کوشش کی لیکن عابدہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

الطاف۔ (حیرت سے محمود کی طرف دیکھتا ہے) تو کیا ابھی کچھ اور بگاڑنا باقی رہ گیا ہے؟

محمود۔ آپ دیکھتے نہیں کہ عابدہ اس قیامت کے بعد بھی عابدہ ہی رہی؟

الطاف۔ اور آپ زندگی کی تلخیاں نہیں دیکھتے؟
محمود۔ زندگی اپنے استحکام کے لئے آزمائشوں کی محتاج ہے۔
جب امتحانی دور گزر جاتا ہے تو کامرانی خود بخود قدم چومتی
ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو نامراد نہیں کرتا۔ وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ
يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا۔ جو شخص اللہ سے ڈر کر اس کے احکام
کی تعمیل میں بہر حال لگا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے
مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔
الطاف۔ اور شریعت الٰہی نے بھی تو اس کا حل واضح کر دیا ہے۔
میری نظر میں عابدہ کے لئے بس یہی ایک صورت اصلاح
حال کی رہ گئی ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ زندگی کا
دستور احکام الٰہی کا پابند نہیں رہا۔
محمود۔ (کچھ سکوت کے بعد) خیر تو میرے لئے آپ کا کیا ارشاد ہے؟
الطاف۔ آپ کی کیا تجویز ہے؟
محمود۔ میں عرض ہی کر چکا۔ میرا جواب آپ عابدہ تک پہنچا دیجئے۔
آپ عابدہ کو اطمینان دلائیے کہ میری حیثیت ایک امین
سے زیادہ نہیں ہے۔ رقم جس قدر بھی مطلوب ہے حاضر ہے۔
الطاف۔ لیکن مجھے جو آپ سے اتفاق نہیں ہے۔ اس میں نہ تو
عابدہ کی بھلائی ہے، نہ اختر کی اور نہ آپ کی۔ یہ ساری
جائداد، پریس، عمارت آپ اختر کی بدعنوانیوں کے

کے حوالے کرنا چاہتے ہیں ؟ اور پھر اس طرح عابدہ جس مصیبت کو ٹالنا چاہتی ہے وہ نازل ہو کر رہیگی۔

محمود ۔ (مسکرا کر) آپ میری بات تو پہنچا دیجئے۔ آپ تشریف لیجائیے۔

الطاف ۔ مجھے اس کی تعمیل سے انکار نہیں ہے۔ میں نے ایک بات مشورۃً اور مصلحۃً کہی ہے اور یہی عابدہ سے بھی کہوں گا۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔ (وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔)

محمود ۔ (کرسی سے اٹھتے ہوئے) تو پھر میں کل صبح آٹھ بجے حاضر ہو جاؤں گا؟

الطاف ۔ (محمود سے ہاتھ ملاتا ہے) مناسب ہے۔ میں منتظر رہوں گا۔ السلام علیکم۔

محمود ۔ وعلیکم السلام۔ (الطاف چلا جاتا ہے)

منظر چہارم

[اختر کے مکان کا زنانہ دالان، دالان کے وسط میں ایک گول میز ہے جس کے گرد چند کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ سامنے کشادہ صحن ہے۔ صحن کے بیچ میں ایک حوض ہے۔ گھاس کا تختہ حوض کو گھیرے ہوئے ہے جس کے گرد رنگارنگ پھولوں کے پودے گملوں میں لگے ہوئے ہیں۔ عابدہ دالان میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی خاموش نظروں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی ہے۔ وقفے وقفے سے اس کی پیشانی پر ہلکا سا بل آجاتا ہے۔ اس کے چہرے سے وحشت اور پریشانی ظاہر ہوتی ہے۔ پہلے خادمہ، پھر الطاف داخل ہوتے ہیں۔ عابدہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔]

عابدہ۔ آداب عرض، بھائی جان!

الطاف۔ کیوں عابدہ خیریت تو ہے؟

عابدہ۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہے) تشریف رکھیئے۔ (الطاف اور عابدہ بیٹھ جاتے ہیں) میں نے آپ کو مجبوراً تکلیف دی ہے۔ معاف کیجیئے گا۔

الطاف۔ کیوں، آخر بات کیا ہے؟

عابدہ۔ آپ کے عزیز بھائی کا مزاج ان دنوں کچھ ایسا برہم ہے کہ

عقل کام نہیں کرتی۔ یوں تو عافیت کی کوئی ساعت اس زندگی کو نصیب نہ ہو سکی۔ لیکن اب ایک عجیب دماغی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔

الطاف۔ (پریشان ہو کر) خدا خیر کرے۔ آخر یہ بے سبب جنون کیا معنی؟

عابدہ۔ یہ تو آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں کیا عرض کروں؟..... (ٹھنڈی سانس لے کر) کیا بتاؤں طبیعت کچھ ایسی پریشان ہے کہ زندگی سے وحشت ہونے لگی ہے۔ (اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں)

الطاف۔ (عابدہ کی طرف دیکھ کر) بس گھبرا گئیں؟

عابدہ۔ (رومال سے آنسو پونچھتی ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔ اب ہر چیز سے ہاتھ دھونے کا وقت آ گیا ہے۔

الطاف۔ تو اب صورت کیا ہے؟

عابدہ۔ صورت کیا بتاؤں؟ ایک مصیبت ہو تو رو کر دل کی بھڑاس نکال لوں۔ ساری زندگی مصیبت بن کر رہ گئی ہے

الطاف۔ کتنا افسوس ہے کہ یہ گھر بھی تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔

عابدہ۔ جو حالات ہیں آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اور جو مصیبتیں کھڑی ہو گئی ہیں وہ بھی ظاہر ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ زندگی

کی اس تباہی کا مجھے بالکل ملال نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جب انسان مادیت کے پیمانے سے زندگی کی قدروں کو ناپنے لگتا ہے اور ازلی صداقتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تو اس کی زندگی اسی طرح مصیبت کا شکار ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنے ضمیر کے خلاف، اللہ کے احکام کے خلاف اور اپنے رجحانات کو پامال کرتے ہوئے اصلاح کی ایک موہوم امید میں اس زندگی کی خاطر کیا کیا نہیں کیا۔ لیکن اب جب کہ حرماں نصیبی کی آخری منزل نظر آرہی ہے، ہر سہارے سے ہاتھ دھونا بہتر سمجھتی ہوں۔

الطاف۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

عابدہ۔ میرا خط شاید آپ نے بغور نہیں پڑھا۔

الطاف۔ تعجب ہے تمہاری سی عقلمند عورت عواقب کو نہیں سمجھتی۔

عابدہ۔ اب میں عواقب کو سمجھ کر بھی کیا کروں گی؟ اس خیال کو بھلا دینا ہی بہتر ہے عقل تو فقط اسباب کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔

الطاف۔ یہ تمہارا اختیار ہے۔ اور میاں محمود کے بارے میں تمہیں مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت ایک آئینہ سے زیادہ نہیں گردانتے۔

عابدہ۔ اس باب میں میرا اطمینان جس درجے کا ہے اس سے بڑھ کر

کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ (اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ پھر رومال سے آنسو پونچھتی ہے) میں اپنی دیوانگی کے لئے آپ حضرات سے معذرت خواہ ہوں اور آپ کے خلوص کی ممنون ہوں۔ میں اس زندگی کی خاطر ایک آخری تدبیر اختیار کر رہی ہوں۔ شاید میں اس طرح تباہی کے وقت کو ٹال سکوں یا اس سے دوچار ہونے کے لئے کچھ مہلت پا سکوں۔

الطاف۔ آخرکار تمہیں کف افسوس ملنا پڑے گا۔ تم دیوانی کیوں ہو رہی ہو؟

تاہیدہ۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ بات یہ ہے کہ ناکامی اور مصیبت کا شدید احساس انسان میں دیوانگی پیدا کر دیتا ہے۔ پراگندہ دل، پراگندہ دماغ عقل و شعور کھو بیٹھتا ہے۔ یہ دیوانہ پاشی غم و اندوہ پر فراموشی کے پردے ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ اندوہ ربائی کے لئے جنون سے بہتر کوئی دوا نہیں۔ (وہ سرد آہ بھرتی ہے) لیکن افسوس!

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

خدا کے لئے آپ اس مصیبت کو ٹالیے۔ یہ آپ کا فرض ہے اور میری درخواست ہے۔ آپ نے اپنی ساری ذمہ داری

میرے کندھوں پر ڈالدی ہے۔

الطاف۔ مجھے اپنی ناعاقبت اندیشی اور ناقابل تلافی خطا کا اقرار ہے اور میں معذرت خواہ ہوں۔ حقیقت میں میں تمھارے سامنے نادم ہوں۔

عابدہ۔ یہ آپ کی نوازش ہے۔ اور مجھے کسی کو الزام دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے غم واندوہ کی شکایت بس ایک ہی بارگاہ سے کرتی ہوں۔

(وہ بے اختیار آنسو بہانے لگتی ہے۔)

الطاف لیکن تم نے تو صبر جمیل پر بڑے لکچر دیئے ہیں۔ اب خود بے صبری کا شکار ہو گئیں۔؟

عابدہ۔ (آنسو پونچھتی ہے) میں نے اپنی داستان بہت مختصر کہی ہے۔ نہیں، ابھی بیان ہی نہیں کی۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

الطاف۔ اختر ہیں کہاں؟ (وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے)

عابدہ۔ (کھڑی ہو جاتی ہے) وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ فرمائیں تو میں بھی چلی چلوں۔

الطاف۔ نہیں، تم یہیں رہو۔

(الطاف چلا جاتا ہے)

—٥)————(٥—

منظر پنجم

(اختر اپنے کمرے میں دروازے کی طرف رخ کیے ہوئے چھپر کھٹ پر شال اوڑھے بیٹھا ہے۔ کمرے میں دری بچھی ہے۔ چھپر کھٹ کے پاس ایک چھوٹی میز ہے۔ میز پر ایک سنگار کا ڈبا رکھا ہے اور قریب ہی تین کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ کونے میں ایک میز پر ریڈیو سیٹ رکھا ہوا ہے۔ چھپر کھٹ کے مقابل کی دیوار کے بیچ میں ایک دروازہ ہے، جس کے دونوں طرف ایک ایک کھڑکی ہے۔ دوسرا دروازہ اختر کی داہنی جانب متصل کمرے کی طرف ہے۔ بائیں طرف ایک کھڑکی صحن میں کھلتی ہے، جس سے باغ کے سرسبز درخت نظر آتے ہیں۔ اسی کھڑکی کی دیوار سے لگی ہوئی ایک الماری اور سنگار دان ہیں۔ سنگار دان کے سامنے ایک خوبصورت تپائی ہے۔ کمرے میں ہر چیز صاف ستھری قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ اختر چھپر کھٹ سے اٹھتا ہے اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ بظاہر باغ کے پھولوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کے ملول چہرے پر وحشت اور پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتا ہے۔ الطاف کمرے میں داخل ہو کر دروازے کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اختر کی حالت کا جائزہ لیتا ہے۔)

اختر — (آپ ہی آپ) یہ لعنتی دنیا، لعنتی انسان۔

(اختر اپنے ہاتھ کا معائنہ کرتا ہے۔ وہ سنگار دان کے پاس جا کر آئینے میں چہرے کو غور سے دیکھتا ہے، پھر کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے)

دنیا کی نفرت کا شکار، زندگی کی لعنت میں گرفتار قیامت سے پہلے قیامت کی تلخیوں کا مارا ——— کیا دوست اپنے دوست سے دور بھاگیں گے؟ جس کا وجود ننگ وجود ہو اس کی زندگی کیسی؟ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) .... سطح ارضی کو اب شاید زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔ زندگی کا فساد زندگی کو اندر سے پھونک رہا ہے۔ اس شاندار تخلیق کا انہدام لاکھوں تمناؤں کو دفن کر رہا ہے۔ مادے کی ترکیب میں فساد کا ظہور زندگی کا کیسا المناک سانحہ ہے! کیا یہ سرمدی عذاب آہستہ آہستہ زندگی کو ایک عبرتناک تماشا بنا دیگا؟ ——— کاش! یہ آتش فشاں اکبارگی پھٹ پڑتا تو عالم فراموشی میں چین تو نصیب ہوتا۔ ایک شخص ہے کہ جینے کو ترس رہا ہے، مگر موت اسے نہیں چھوڑتی، اور ایک مرنے کے لئے بے چین ہے مگر موت اسے نہیں آتی۔

(الطاف آگے بڑھتا ہے اور چپھر کھٹ کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قدموں کی آہٹ پا کر اختر مڑ کر دیکھتا ہے۔)

الطاف۔ (مسکرا کر) تو کیا گوشہ نشین ہو گئے؟
اختر۔ (حیرت سے) آپ کب تشریف لے آئے؟
الطاف۔ بس ابھی آیا۔ اور تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچا۔ (اختر اور الطاف کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں) نوکر سے دریافت کیا، معلوم ہوا لیٹے ہیں۔ کیوں طبیعت تو اچھی ہے؟
اختر۔ یونہی کچھ گرانی سی محسوس کرتا ہوں۔
الطاف۔ باہر نکل کر چہل قدمی کر لیتے تو طبیعت بحال ہو جاتی۔
اختر۔ میرا دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔
الطاف۔ تو ڈاکٹر کو نہ بلا لیں؟
اختر۔ نہیں ڈاکٹر کیا کرے گا؟
الطاف۔ تو پھر خواہ مخواہ اس وہم میں کیوں پڑ گئے ہو؟
اختر۔ (اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، اور اس کی نظروں سے غیظ و غضب ٹپکتا ہے) آپ دیکھتے نہیں؟ میں اس وقت بھی مسحور ہوں۔ اس نے مجھ پر سحر کیا ہے۔

(الطاف تعجب سے اختر کی طرف دیکھتا ہے)

الطاف۔ کیا ڈاکٹر عزیز کے بارے میں کہہ رہے ہو؟
اختر۔ ساری دنیا کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔
الطاف۔ یہ خوب ہوا کہ کم از کم اب تو تم نے ڈاکٹر کے مکر کو پہچانا۔
اختر۔ میں نے ساری دنیا کے مکر کو پہچانا۔ اس فساد میں اس کی

پھوپھی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ اور پھر اس بدبخت عورت کو بھی تو اسی سے لگاؤ ہے۔ آزادیٔ نسواں کی علمبردار عورت آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہے۔ (آواز بلند کرکے) آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ یہ کھیل کیوں کھیلا جا رہا ہے؟

الطاف۔ میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔ تم عابدہ کے متعلق کہہ رہی ہو؟

اختر۔ آپ سمجھ کر انجان بنتے ہیں۔

الطاف۔ بھائی یہ محض تمہارا خیال ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اختر۔ (بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) اب میں اپنا درد کس سے کہوں؟ ساری دنیا تو دشمن بن گئی ہے۔ اس وقت دوست دشمن ایک ہو گئے ہیں۔

الطاف۔ لیکن میں تو تمہارا دشمن نہیں ہوں۔

اختر۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں، اس کانفرنس کی روداد سناتے کیوں نہیں؟ ڈاکٹر کا کیا بیان ہے؟ عدالت کا کیا فیصلہ ہے؟ اور یہ محمود کا کیا معاملہ ہے؟ آپ یہ راز فاش کیوں نہیں کرتے؟

الطاف۔ (جیب سے رومال نکال کر وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہے) یہ محض تمہاری پریشان خیالی ہے۔ کوئی راز ہو تو

فاش کردں .... اور یہ کانفرنس کیسی ؟

اختر۔ (سر پیٹ کے) بھائی صاحب! یہ آپ کو کیا ہو گیا ؟ آپ سچ سچ کیوں نہیں بتاتے کہ آخر یہ کیا سازش ہے ؟ ہر شخص مجھے گھورتا ہے۔ کل جو فدا تھے آج نام سے بیزار ہیں۔ نظروں سے نفرت اور دشمنی ٹپکتی ہے۔ (اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ الطاف افسوسناک نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے۔)

افلاس و نکبت کا مارا ذلیل و خوار اختر ساری دنیا کی نظر میں کھٹکتا ہے۔ یہ رسوائی تو بین الاقوامی ہو چکی ہے۔ آج اختر بین الاقوامی رسوا ہے۔ دنیا میں بدبختیوں کے مارے ہزاروں گذر گئے! اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی لیکن یہ کیسا طوفان ہے! اس ایک بدبخت کے لئے ساری دنیا کیوں اٹھ کھڑی ہوئی ہے ؟ کوئی اخبار میرے ذکر سے خالی نہیں۔ آپ نے تاریخ عالم بھی پڑھی ہے۔ کیا اس سے بڑا رسوا آپ کی نظر سے گذرا ہے ؟

الطاف۔ یہ فقط تمہارا گمان ہے۔ اور یہی گمان بڑھ کر بدگمانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اختر۔ اس کم بخت محمود کے اخبار کا کوئی کالم نہیں جو میری رسوائی سے خالی ہو۔ میں اس طوفان سے کیوں کر آنکھیں

بند کر لوں۔ کتاب میں سمجھتا ہوں۔ بڑا پروپگنڈہ ہو رہا ہے۔
میری رسوائی کے لئے بڑا اہتمام ہو رہا ہے۔

الطاف۔ میری سمجھ میں نہ آیا بھائی کہ یہ بے سبب بدگمانی آخر تم نے کیوں پیدا کر لی ہے۔ کم از کم تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

اختر۔ (آواز کو بلند کر کے) آپ انجان کیوں بنتے ہیں؟ یہ منافقت آپ نے کب سے سیکھ لی ہے؟

الطاف۔ کیا بات ہے اختر! تم ہوش کی بات کیوں نہیں کرتے؟

اختر۔ تو کیا ہوش کی بات نہیں کر رہا ہوں؟

الطاف۔ تمہیں وہم نے پریشان کر رکھا ہے۔ وہم انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔

اختر۔ ہاں تو یہ کہیے کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔

الطاف۔ خدا نہ کرے۔ یہ تمہاری پریشان خیالی ہے۔

اختر۔ آپ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟ کیا واقعی میں دیوانہ ہو گیا ہوں؟

الطاف۔ دیوانگی بالکل نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ جو تم تنہائی میں بیٹھے سوچتے رہے اور پریشان خیالی انتہا کو پہنچ گئی تو تمہارے وہم و گمان نے بڑھ کر ایک بے بنیاد عمارت تعمیر کر لی ہے۔ اس بدگمانی کو دل سے نکال دو۔

اختر۔ اسے نکال کیونکر دوں؟ کوئی تدبیر ہو تو بتائیے۔ میں ایک حقیقت کو کیسے مٹا دوں؟

الطاف۔ آخر تم نے ساری دنیا کو دشمن کیوں سمجھ رکھا ہے؟

اختر۔ تو میرا دوست ہے کون؟

الطاف۔ مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے؟

اختر (بے توجہی سے عاجزانہ لہجے میں) میں کہتا ہوں کہ آپ میرے دوست کیوں نہیں بن جاتے؟

الطاف۔ کیا میں نے تم سے دشمنی بھی کی ہے؟

اختر۔ میں آپ کا احسان مند ہوں، لیکن میری زندگی کا راز جانتے ہوئے بھی مجھ پہ ظاہر کیوں نہیں کرتے؟ یہ کیا بات ہے؟ کیا مصلحت ہے؟ یہ ڈراما تو سارے شہر میں کھیلا جارہا ہے۔ آخر اس ڈرامے کے تماشائی کون رہے ہیں؟

الطاف۔ تم کس ڈرامے کا ذکر کر رہے ہو؟

اختر۔ (غصے کا اظہار کرتے ہوئے) آپ مذاق کر رہے ہیں؟

الطاف۔ میں تمہاری گفتگو سن کر حیران ہوں۔ دنیا بھر سے تمہیں بدگمانی ہے۔ تمہارے نزدیک سب جھوٹے اور فریبی ہیں، کوئی سحر کر رہا ہے، کوئی زہر دے رہا ہے۔ ٹھکانے کی بات کرو تو کوئی کچھ کہے۔

اختر۔ (جھنجلا کر) اچھا تو اس قصّے کو جانے دیجئے۔ میں سب جانتا ہوں۔

الطاف۔ تم کچھ نہیں جانتے۔

اختر۔ اچھا، بس ختم کیجئے۔ یہ زندگی کے نشیب و فراز ہیں صاحب! میں پہلے ہنستا تھا، ہمیشہ ہنستا رہا، پھر روتا رہا، پھر کبھی ہنستا اور کبھی روتا رہا، پھر فقط ہنستا رہا، اب نہ ہنستا ہوں نہ روتا ہوں۔ آپ دیکھتے نہیں، ساری دنیا مجھ پر ہنس رہی ہے۔ یہ راز فاش ہو کر رہیگا۔ یہ تماشا کتنا دردناک ہے! قدرت کی ستم ظریفی کا تماشا دیکھ لیجئے۔ جب تک.........

(آنکھوں سے انتہائی وحشت برستی ہے۔ الطاف حیرت سے اختر کے چہرے کو بغور دیکھتا ہے۔)

الطاف۔ کچھ مجھے بھی تو کہنے دو۔

اختر۔ جب تک میں ہوش میں ہوں، ہوش میں ہوں۔ پھر نہ ہوش ہے، نہ زندگی۔ پھر نہ کہنا کہ اختر زندگی سے تنگ آکر موت کا شکار ہو گیا۔

اے کاش مجھے زندگی ہی عطا ہوئی ہوتی، یا موت ہی دی جاتی۔ یہ کیا قیامت ہے۔

زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا۔

(خادمہ ایک طشت میں چا و پھل وغیرہ لئے ہوئے داخل
ہوتی ہے، اور اختر اور الطاف کے درمیان ایک چھوٹی
میز پر رکھ دیتی ہے۔ اختر خاموش ہو جاتا ہے۔)

الطاف (اختر کی طرف دیکھ کر) تو کیا مہمان کو پہل کرنی چاہیئے؟

اختر۔ کیا بتاؤں کچھ سوجھتا نہیں۔

(وہ میز کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ دونوں خاموشی سے
کھانے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک سکوت طاری رہتا ہے۔
اختر ذرا سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے، اور الطاف کی طرف دیکھتا ہے)

اختر۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ صوفیہ کو آپ لوگ مجھ سے ملنے کیوں
نہیں دیتے؟

الطاف۔ صوفیہ ہے کہاں؟

اختر۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں؛ اسی شہر میں۔

الطاف۔ یہ تمہیں کیونکر معلوم ہو گیا؟

اختر۔ میرے وجدان نے مجھ پر روشن کیا ہے۔

الطاف۔ یہ تمہارا خیال ہے۔

اختر۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میں خوشی سے مر جاؤں گا؟

الطاف۔ تمہارا وہم تمہیں پریشان خیالی میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

اختر۔ تو یہ کہیئے کہ اس کے ہاتھ میری بہن کے خون میں رنگے ہوئے
ہیں۔ (وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور کچھ سکوت کے بعد آنکھیں کھول لیتا ہے)

یہ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے کسی بات کا نوٹس دیجیے۔ ہر خیال
تو جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

الطاف۔ ہر خیال صحیح بھی تو نہیں ہو سکتا:

اختر۔ تو کیا صوفیہ کا وجود ہی حرف غلط ہے!

الطاف۔ نہیں، بلکہ صوفیہ کے متعلق تمہارے توہمات غلط ہیں۔

اختر۔ تو پھر وجود کا خیال بھی موہوم ہے۔

(اس کے احساسات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ کانپنے
لگتے ہیں۔ الطاف حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے)

میں صوفیہ کی سرنوشت محمود کے قلم سے لکھنا چاہتا ہوں۔

(وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے)

سر بریدہ، خون آلودہ، سسکتی ہوئی جانیں، نکلتی ہوئی
روحیں، لاشیں ہی لاشیں، خون ہی خون، آنسو ہی آنسو۔

(وہ آنکھیں کھولتا ہے)

آپ دیکھتے نہیں؟ .... بس ہو چکا۔ ہو چکا۔

الطاف۔ (اختر کے چہرے کو مایوس نظروں سے دیکھتا ہے) یہ کیا بات
ہے بھائی!

اختر۔ ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

الطاف۔ تم کیا محسوس کرتے ہو اختر؟

اختر۔ کیفیات کے لئے الفاظ ہی مل جاتے تو ....

(وہ خاموش ہو جاتا ہے)

الطاف۔ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) کیا بات کہی ہے! جملہ پورا کر دو۔

اختر۔ میرا بس چلتا تو میں اپنا سینہ کھول کر نہ دکھا دیتا!

الطاف۔ صحیح ہے، انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔

اختر۔ وہ اپنا درد بھی تو بیان نہیں کر سکتا۔ (وہ اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا ہے۔)

الطاف تو کیا مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟

اختر۔ (وہ سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے) حیرت تو یہ ہے کہ اتنا ہوش بھی کیوں باقی رہ گیا۔ بہت سی زندگیاں فقط عبرت کے لئے ہوتی ہیں۔ یہ بین الاقوامی رسوا آگ میں جل کر بھی موت سے لڑ رہا ہے۔

الطاف۔ وہ کونسی رسوائی ہے جس کا تم ماتم کر رہے ہو؟

اختر۔ وہ ایسا راز ہے جسے ساری دنیا جانتی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے سینے میں لیتا جاؤں۔

الطاف۔ (اختر کے حواس باختہ چہرے پر نظر کر کے) یہ آج تم کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ انسان اسباب میں الجھ کر دل میں مایوسی پیدا کر لیتا ہے۔

(دونوں خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں)

اختر۔ (سکوت کو توڑتے ہوئے) اب میں کیا بتاؤں کہ میرے اندر کیسا طوفان برپا ہے۔

الطاف۔ یہ طوفان محض خیالی ہے۔

اختر۔ طوفان تو سب ہی خیالی ہوتے ہیں۔ کاشکے انسان بے خیال بن جاتا۔

(عابدہ داخل ہوتی ہے' اور چپکے سے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

الطاف۔ بے خیال بھی بن سکتے ہو' بشرطیکہ تم اپنے خیال کو کارساز کے حوالے کر دو۔ زندگی کو فقط یہی ایک سہارا کافی ہے۔

اختر۔ (تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) کاشکے زندگی کو یہی ایک سہارا مل جاتا۔ لیکن حیات انسانی کا بڑا سانحہ یہ ہے کہ زندگی کا خالق پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کارسازی اس کے بس میں نہیں ہے۔

الطاف۔ نعوذ باللہ!

عابدہ۔ اس کی (اختر مڑ کر عابدہ کی طرف دیکھتا ہے) کارسازی کا مشاہدہ ہم ہر جگہ کر سکتے ہیں۔ آفتاب کی تمازت میں' ماہتاب کی ضیا پاشی میں' ستاروں کی جگمگاہٹ میں' کہکشانی راستہ کیا ہم نہیں دیکھتے؟ بادلوں کی گرج میں' بجلیوں کی چمک میں' ہواؤں کے چلنے میں' دریاؤں کے بہاؤ میں' شجرو

حجر میں اس کا ظہور ہے، پتّے پتّے سے اس کی ربوبیت آشکارا ہے۔ نسیم سحر نے یہی گنگنایا ہے۔ ننھے پرند نے اسی کا گیت گایا ہے، گونجتی ہوئی وادیوں میں یہی ایک ترانہ ہے۔ زندگی کی چہل پہل اسی کے کرم سے ہے۔ نفس کی آمد و شد اسی کے دم سے ہے۔ مردہ رحوں کی جان بخشی اسی ایک بارگاہ کا انعام ہے، اس کا باران رحمت خاک سے کیسی کیسی زندگیاں وجود میں لا رہا ہے! اس کی شبنم کا قطرہ کتنے تشنہ لبوں کی پیاس بجھا رہا ہے۔ کتنی زندگیوں کا سامان اس ایک قطرہ کو بخشا گیا ہے! انسان کے گرد و پیش بس اسی کارسازی کا تماشا ہے۔ اس کی یہ بخشش ہر درماندہ کے لئے صلائے عام ہے۔

اختر۔ اس عورت کے حسین تخیل نے کارساز دوعالم کی کیسی پیاری تصویر کھینچی ہے (چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے) لیکن یہ حرف و صوت کی خوبصورتی، سمع و بصر کا فریب ہے..... (الطاف سے) میری زندگی کی پریشانی میں اس عورت کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس نے میرے حوصلوں کی ہر تمنّا کو پامال کیا۔ اور وہ اپنی شام سحر کی دعاؤں میں مجھے کوستی رہی ہے۔ میری زندگی کے فساد میں اس کی آہیں بھی شامل ہیں۔ اس کے زہریلے نفس نے میرے وجود کو مسموم کر دیا ہے۔

ہیں اس سے بدگمان ہوں۔ اب وہ میرے حضوری میں یا
جنت لیکر بھی کھڑی رہے تو مجھے قبول نہیں ......
ہاں وہ جیتی میں ہارا۔ یقیناً میں ہارا۔

الطاف۔ (اختر سے) یہ کیا تم نے پریشان خیالی پیدا کر رکھی ہے۔

اختر۔ (عابدہ کی طرف وحشت انگیز اور غضبناک نظروں سے دیکھتا ہے)
چا اے بدبخت عورت، میری نظروں سے دور ہو۔ جا،
چلی جا ....

(عابدہ کرسی سے اٹھ جاتی ہے۔ الطاف پریشان
ہوکر عابدہ کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ چلی جاتی ہے۔)

منظر ششم

(رات کا وقت ہے۔ کوئی دو بجے کا عمل ہوگا۔ بارش کا موسم ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان کے کناروں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اختر اپنے مکان سے نکل کر سڑک سے گذرتا ہوا جنگل کا رخ کرتا ہے۔ حالی پریشان، بال پراگندہ، کپڑے قمیص پاجامے پر مشتمل، وہ گہرے سوچ میں ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔ جنگل میں ایک طرف پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک نکل گیا ہے۔ اختر چلتے چلتے رک جاتا ہے اور اپنے گرد و پیش بے معنی نظریں دوڑاتا ہے۔)

اختر - (آپ ہی آپ) یقیناً ایسی زندگی جو وبال جان ہو، اپنے وجود کے اندر پھٹکار اور وجود کے باہر لعنت ہے۔ یہ لعنتی انسان اس بوجھ کو کہاں کہاں لئے پھرے گا۔ ہر گوشے سے "دور، دور" کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ سڑے گلے مادے کے لئے ذلت کی زندگی کا سہارا ہی ایسا کیا ضرور ہے۔ (سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے)

وہ ستارے مسکرائے، وہ چاند نکل آیا۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کس نکھرے ستھرے بارگاہ کی بخشش ہے؟

(آندھی اور ہوا کے ساتھ ابر کے ٹکڑے چاروں طرف سے جمع ہونے لگے ہیں)

یہ طوفان کہاں سے اٹھا؟ یہ کالے کالے بادل تہ بہ تہ؟
یہ تیز و تند ہوائیں کس چراغ سحری کو بجھانا چاہتی ہیں؟
(بجلی اور گرج کے ساتھ آسمان پر آہستہ آہستہ سیاہی چھیلنے لگتی ہے)
بادل چھٹ نہ جائیں گے؟ مطلع صاف نہ ہو جائیگا؟
(وہ ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا ہے)
افق کی تیرگی کو روشنی عطا کرنے والا کہاں ہے؟ کہاں
ہیں آسمان کے ستارے؟ جگمگا جگمگا کر تھک گئے؟
سو رہے ہیں؟
آہ! آسودگی کے آغوش میں سونے والی دنیا اس نامراد
سے کتنی دور ہے! ایک فراموشی، ایک سکوت .....
ایسے کتنے سفینے ساحل کی تمنّا کو سینوں میں لئے ہوئے
مہیب تاریکی میں گم ہو گئے! یہ سمندر ہی دفینے کن شکستہ
دلوں کی امانت ہیں؟
(ایک سرد آہ نکلتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ تھوڑی دیر
خاموش رہتا ہے۔ پھر آنکھیں کھول دیتا ہے)
یاس و ناامیدی کا مارا انسان، سسکتی ہوئی ناتوانیوں کو
لئے ہوئے کب تک زندگی کا شکار رہیگا؟ (وہ چلّاتا ہے)
ایک انہدام، ایک شکست ....
(بے قرار ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے)

وہ آسمانوں سے بجلیاں برسیں ۔۔ زمینوں سے آتش فشاں نہ پھٹ پڑیگا؟ کتنے آفتابوں کو اندھیرا کھا گیا! کتنے ماہتابوں کو گہن لگ گیا! کائنات کی تیرگی کا کوئی اندازہ بھی ہے اے ہم نفس! ــــ اب سِسکرانے سے فائدہ؟ فضاؤں کی روشنی اندھیروں میں گم ہے ۔۔ ایک سکوت، ایک سناٹا۔

(فضا میں طوفان برپا ہوتا ہے۔ ہوا، بجلی اور گرج کے ساتھ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگتی ہے)

ہاں تو یہ سیاہ چادر وجود کو لپیٹ لے گی؟ ساری کائنات اس ہمہ گیر تاریکی میں گم ہے۔

(جذبات سے مغلوب ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے)

وجود کا دشمن، خالق وجود اب تماشا ختم کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کا شیریں خواب آتشیں بجلیوں میں گھر گیا۔ آہ! تجلیات کی دنیا کا خواب دیکھنے والا انسان آج جہنم کے شعلوں سے کھیل رہا ہے ــــ سو جاؤ سو جاؤ خاموش ہو جاؤ، توانائیوں میں حرارت نہ رہے۔ زندگی میں حرکت نہ رہے۔ نظروں میں سکینی، قدموں میں لاغری گفتار میں نرمی، کردار میں سردی، نفس کی خنکی زندگی کی حرارت کو سلب کر رہی ہے۔ اٹھنا بیٹھنا ہواؤں کا سہارا ڈھونڈ رہا ہے۔

چلنا پھرنا زلزلوں سے لرز رہا ہے، یہاں گرا، وہاں گرا۔
اب اس لاغری کو کون سنبھال سکتا ہے؟ زندگی کے مآل
پر نظر کرنے والا انسان وجود کے تصور سے کانپ رہا ہے
—— کہ وہ آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے، اندر
باہر، بجلیوں کی آبدار تیغوں کی زد میں آگیا۔

(تھوڑی دیر سکوت کے عالم میں خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا ہے۔ پھر اچانک جذبات سے مشتعل ہوکر لڑکھڑاتے قدموں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک دبی ہوئی چیخ نکلتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش دیوانہ وار نظریں دوڑاتا ہے اور چلاتا ہے)

ٹھہرنا، سنبھلنا، وہ کٹا، وہ گرا —— آہ! یہ زندگی!
یہ انسان!

(ریل کی سیٹی کی تیز آواز سنائی دیتی ہے۔ اختر چونک کر پیچھے مڑکر دیکھتا ہے۔ دور تاریکی میں روشنی نظر آتی ہے۔ وہ سینے کو ابھار کر غور سے روشنی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے چہرے سے انتہائی اضطراب اور بے چینی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ہونٹوں کو زور سے دانتوں کے بیچ میں دبا لیتا ہے پھر ٹھنڈی سانس لے کر سکوت کو توڑتا ہے۔)

یہ زندگی ویرانوں کی تلاش میں کہاں ماری ماری پھر گئی؟

(آنکھیں بند کر لیتا ہے اور لمبی سانس لینے لگتا ہے۔)

خاموش، خاموش ہو جاؤ ——— حرکت کا حاصل سکون ہے،
زندگی کا حاصل، موت ———
(آنکھیں کھولتا ہے اور تیزی سے بڑھتی ہوئی ریل پر نظر جا لیتا ہے)
کتنی دیر ہے؟ ——— کتنا فاصلہ ہے؟ ——— نہیں،
ابھی تو بہت ——— بہت دور ہے۔ سیاہیاں اگلتی ہوئی
شعلے برساتی ہوئی، سیاہ رو، سیاہ پوش، گھومتی گھاتی
چیختی چلاتی، ناچتی گاتی، گنگناتی لہراتی ۔

(ریل قریب پہنچ جاتی ہے)

وہ آگئی ——— وہ آگئی ۔

آہ! ——— (ایک ڈراؤنا تبسم اس کے چہرے پر دوڑ جاتا ہے۔)

آہ! ——— کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آسان ہے موت!

(اختر ریل کے انجن کے سامنے پٹری کی طرف بے تحاشا دوڑتا ہے۔)

